علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم

طلوعِ اسلام

ایک اسلامی مجلہ

اکتوبر ۱۹۴۹

ایک روپیہ

ایک دن میں دس کروڑ روپے کا نقصان

هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا (۱۸/۱۰۳)

کیا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ کون ہیں جنہیں اپنے کاروبار میں سب سے زیادہ خسارہ ہوا؟

سوچیے! کہ اگر کوئی شخص تیس چالیس روپے کا سودا خریدے اور اس میں سے صرف پانچ روپے کی چیز کام آئے اور باقی روپے کا مال اِدھر اُدھر ضائع ہو جائے۔ تو اس سے زیادہ گھاٹے کا سودا اور کیا ہوگا؟ اور اس کے باوجود وہ اس "تجارت" کو برابر جاری رکھے؟ آپ حیران ہوں گے کہ اس قسم کا کاروباری کون ہو سکتا ہے؟

لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ یہ کاروبار آپ خود کرتے ہیں اور ہر سال کرتے ہیں۔

آپ عید پر تیس چالیس روپے کا بکرا خریدتے ہیں۔ اور اس کی کھال جس کی قیمت پانچ روپے سے زائد نہ ہوگی، کشمیر فنڈ میں دیدیتے ہیں۔ باقی قسم کا گوشت کسی کام نہیں آتا۔ اس لئے کہ جن دوستوں کے ہاں آپ گوشت بھیجتے ہیں وہ اتنا ہی گوشت لوٹا کر آپ کے ہاں بھیج دیتے ہیں۔ باقی رہا اللہ سے معاملہ سو اس نے پہلے ہی کہہ رکھا ہے کہ

یہ گوشت ہم تک بالکل نہیں پہنچتا۔

پھر فرمائیے کہ اس تجارت سے آپ کو ملتا کیا ہے؟

اور پوری کی پوری قوم اس تجارت میں لگی ہوئی ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں!

فرض کیجیے کہ پاکستان کی سات آٹھ کروڑ آبادی میں سے صرف ایک کروڑ مسلمان قربانی دیتے ہیں اور فی قربانی کم از کم دس روپے کا گوشت ضائع ہوتا ہے، تو عید کے دن بارہ بجے تک دس کروڑ روپے کا قومی سرمایہ ضائع ہو جاتا ہے اور یہ دس کروڑ ہر سال ضائع ہوتے ہیں۔

خدا کے لئے سوچیے کہ عید کی صبح، بارہ بجے تک، قوم کا کس قدر روپیہ نالیوں میں بہ جاتا ہے۔ اس قوم کا جس کے لاکھوں افراد آج ایک وقت کے کھانے، تن ڈھانپنے کے کپڑے اور سر چھپانے کی چھت کیلئے محتاج ہیں۔

اور اس کے بعد آپ کے ماہرین محترم لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کے الفاظ میں یہ فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ ملک میں کافی سرمایہ موجود نہیں۔ لہٰذا غیر ملکی سرمایہ داروں کو ایسی سہولتیں پہنچائی جائیں کہ وہ اپنا سرمایہ پاکستان میں لگانے پر راغب ہو جائیں۔

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدلِ اشتراک
سالانہ — دس روپے
ششماہی — چھ روپے

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

مرتبہ
محمد یونس

جلد ۲	اکتوبر ۱۹۴۹ء	نمبر ۱۰

فہرست مضامین

لمعات	۸-۱
شخصیت پرستی (محترم پرویز صاحب)	۹-۴۵
استحکامِ پاکستان (اسد ملتانی)	۴۷
اسبابِ زوالِ امت (محترم ابو النظر صاحب رضوی)	۴۹-۶۸
اسبابِ زوال کی عقلی تعبیر (حکیم حیدر زمان صاحب)	۷۲-۶۸
بابُ المراسلات	۷۹-۸۱
(۱) نکاحِ نابالغان	
(۲) عورتوں کو مارنا	
(۳) تصویر	
(۴) قربانی	
رفتارِ عالم	۸۳-۱۰۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآن کریم میں ہجرت سے متعلق آیات کو دیکھئے۔ ایک بہت بڑی حقیقت آپ کے سامنے بے نقاب ہو گی۔ ہجرت کیا ہے اور وہ نظام خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے والی جماعت کے پروگرام میں اس کی حیثیت کس قدر اہم ہے۔ یہ نکات سردست محل گفتگو نہیں۔ اس وقت ہم صرف دیکھنا چاہتے ہیں کہ جب نبی اکرمؐ نے اپنی مختصر سی جماعت کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی ہے تو اس کے بعد جو لوگ مکہ رہ گئے تھے، خود یا اُن کے اعزہ و اقارب جو اسلام لا چکے تھے اور اس طرح اسی پروگرام کو اپنا لائحہ زندگی تسلیم کر چکے تھے جسے ہجرت کرنے والوں نے اپنے لئے نصب العین حیات بنا لیا تھا، ان کے متعلق قرآن کریم نے کس قدر تاکید سے کہا ہے کہ ان سب کو ہجرت کرلینی چاہیئے تاکہ ہجرت کر جانے والوں کا اہل مکہ کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ ان احکام کی شدت و تاکید کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا (۸/۷۲)

جو لوگ ایمان لے آئے تھے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی تو تمہارے لئے ان کی اعانت و رفاقت میں سے کچھ نہیں جب تک وہ ہجرت نہ کر آئیں۔

غور کیجئے! یہ ایمان لانے والے وہ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کی حفاظت میں دنیا بھر کی مصیبتیں جھیلیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں۔ لیکن ان کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ مکہ چھوڑ کر مدینہ نہ آجائیں تو مسلمانوں کی جماعت کا ان کے ساتھ دوستی اور رفاقت کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔ یعنی، جماعت کے ساتھ ان کا تعلق مشروط ہو گیا ہجرت کے ساتھ۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اسلامی نظام اجتماعیہ میں ہجرت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس اہمیت کے وجوہ و دلائل اور مصالح و علل کیا ہیں، اس تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن ایک واقعہ کے سامنے لانے سے اس کے ایک گوشہ کی اہمیت یقیناً واضح ہو جائے گی۔ اور اس سے معلوم ہو جائے گا کہ کچھ لوگوں کا مدینہ چلا آنا اور ان کے اعزہ و اقارب کا مکہ میں رہ جانا حیات اجتماعیہ کے لئے کس قدر ضرر رساں تھا۔

سنہ ۸ھ میں نبی اکرمؐ نے مکہ پر چڑھائی کی تیاری کی اور اس باب میں احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو اس ارادہ کی اطلاع نہ ہونے پائے۔ حاطب ابن ابی بلتعہ۔ ایک معزز صحابی تھے۔ انہوں نے قریش کو خفیہ خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع مل گئی اور حاطب معہ اپنے خط کے آپ کی خدمت میں پیش ہوئے۔

ذرا واقعہ کی اہمیت پر غور فرمایئے! کتنی بڑی "جاسوسی" تھی۔ اور کس کی طرف سے۔ ایک معزز صحابی کی طرف سے جنہوں نے اسلام کی حفاظت میں اپنی عمر جاں فروشی میں بسر کر دی تھی۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے تو انہوں نے جھکی ہوئی نگاہوں سے کہا کہ میرے عزیز و اقرب اب تک مکہ میں تھے اور کوئی ان کا حامی نہ تھا۔ اس لئے میں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ وہ اس کے صلہ میں میرے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے۔

جرم بڑا سنگین تھا۔ لیکن حاکم وہ تھا کہ جس کی نگاہیں فطرت انسانی کے کمزور پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا کرتی تھیں۔ آپ نے محسوس فرما لیا کہ اس لغزش کا اصلی سبب یہ تھا کہ حاطب کے اعزہ و اقارب نے ہجرت نہیں کی تھی۔ اس لئے ان حالات میں اس قسم کی حرکت، البشریت کی کمزوری تھی۔ قرآن نے اسی لئے ہجرت کے لئے تاکیدی احکام دے کر ان محرکات کو بند کرنا چاہا تھا جو اس قسم کی لغزشوں کا باعث بن سکتے تھے۔ چنانچہ حضورؐ نے حاطب کی معذرت کو اپنے عفو کریمانہ سے نوازا۔

یہ واقعہ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کا ہے لیکن فطرت انسانی کی جس کمزوری پر یہ شاہد ہے وہ آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح اس زمانہ میں تھی۔ لہذا، قوموں کی حیات اجتماعیہ کے تحفظ و بقا کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اس قسم کے تمام محرکات و مؤیدات کو ختم کر دیا جائے جو انسانی فطرت کی اس کمزوری سے اس قسم کے واقعات سرزد کرانے کا موجب بن سکیں۔

ہندوستان سے جو لوگ پاکستان آنے پا آنے پر مجبور ہوئے ان میں بیشتر حصہ تو ان کا ہے جو اپنا سب کچھ لے کر یا سب کچھ چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ یہ وہ ہیں کہ وہ ان کے دامن قلب یا گریبان نگاہ کا کوئی گوشہ بھی وہاں کسی کانٹے سے اٹکا ہوا نہیں۔ ان کے لئے اب پاکستان کی سرحد سے اس پار کوئی سامان جاذبیت اور وجہ کشش نہیں، بجز اس کے کہ انہیں اگر مومنانہ شعار زندگی نصیب ہو گیا تو اس "مکہ" میں جہاں سے یہ اس طرح نکلے یا نکالے گئے ہیں، فاتح و منصور پھر سے داخل ہوں گے ان شاء اللہ آمنین محلقین رؤسکم و مقصرین لا تخافون (۴۸/۲۷) لیکن ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو خود تو پاکستان آ چکے ہیں لیکن ان کا سر رشتہ نظر ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لئے کہ کسی کے اعزہ و اقارب وہاں ہیں اور کسی کے اموال و جائداد۔ اور اموال و اولاد انسان کے لئے جس کشش و جاذبیت کا باعث ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔ ان آنے والوں کے صدق و اخلاص میں کوئی شک و شبہ نہ ہو تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ نہ ہم میں سے کسی کا ایمان حضرت حاطب ابن ابی بلتعہ

سے زیادہ صحیح ہے اور نہ ہمارے اعزہ و اقارب کی کشش ان کے اعزہ کی کشش سے کم۔ ان لوگوں کا قلبی اضطراب بیجان قابل فہم ہے۔ یہ خود یہاں ہیں لیکن ان کے دل کی تاریں وہیں بندھی ہوئی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات میں ذرا سی ناخوشگواری کا امکانی خدشہ، ان کے دل کی ان تاروں میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ یہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے اور ہر شخص سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس تقاضے پر یوں غالب آجائے کہ کسی بڑے مقصد کے پیش نظر، اپنے بیٹے کے گلے پر خود اپنے ہاتھ سے چھری پھیر دے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر صحیح علاج یہ نہیں ہوتا کہ فطرت انسانی کو آزمائشوں میں ڈالا جائے بلکہ یہ کہ ان اسباب و علل کو ختم کر دیا جائے جو فطرت انسانی کی اس کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موجب بن سکتے ہیں۔ قرآن نے اسی مقصد کے پیش نظر ہجرت کو اس شرط سے مشروط کر دیا تھا کہ وہ کامل و مکمل ہجرت ہو۔ جو وہاں سے اُٹھے، اپنا دامن ہر قسم کے جذبِ علائق سے جھاڑ کر اٹھے۔ وہ خود آئے تو اس کے ساتھ وہ تمام اعزہ و اقارب بھی آجائیں جن میں اس کا دھیان رہ سکتا ہے۔ باقی رہے اموال و جائداد، سو ان کا پھر خیال تک بھی نہ کرے۔ جو لوگ ہندوستان سے پاکستان آئے ہیں، ان کے لئے بھی سلامتی کی راہ یہی ہے۔ یہاں آچکنے کے بعد، ہندوستان سے جذبات و مفاد کی وابستگی، نہ ان کے دل کو کبھی اطمینان بخش سکتی ہے اور نہ ملت کے اجتماعی مصالح کے لئے ہی سازگار ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ہم متعدد بار کہہ چکے ہیں ہمارے نزدیک، ہندوستان کے مسائل کا حقیقی حل اسی صورت میں ہو سکے گا جب ہم وہاں کے تمام مسلمانوں کو ادھر منتقل کر سکیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ، ہندوؤں کی تنگ نظری کے پیش نظر ہمیں اس مقصد کے لئے ان سے اتنی زمین بزور حاصل کرنی ہو گی جس میں ہم ان تمام مسلمانوں کو بسا سکیں جن پر انہوں نے یوں گوشۂ عافیت تنگ کر رکھا ہے۔ لیکن یہ اس مسئلہ کا آخری مرحلہ ہو گا۔ اس کے تدریجی مراحل میں، سب سے مقدم کام یہ ہے کہ جو مسلمان ادھر آچکے ہیں، ان کے جذبات۔ و مفاد کو یکسو کر دیا جائے۔ اِدھر آجانے والے مسلمانوں کی جائدادوں سے متعلق، ہندوؤں کے آئینی استبداد نے جو لوٹ وہاں مچا رکھی ہے وہ احترام آدمیت کی ہر عدالت میں ہزار لعنت و نفرین کی موجب ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ

عدو شرے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد

اس لوٹ کھسوٹ میں ایک خیر کا پہلو یہ ضرور ہے کہ اس سے ادھر آجانے والے مسلمانوں کے ہندوستان سے اقتصادی تعلقات طوعاً و کرہاً منقطع ہو جائیں گے۔ باقی رہے جذباتی تعلقات۔ یعنی ان کے اعزہ و اقارب۔ سو اس باب میں ہم حکومت پاکستان کو مشورہ دیں گے کہ وہ، کچھ نقصان برداشت کر کے بھی، اتنا ضرور کریں کہ ان لوگوں کے اعزہ و اقارب کو پاکستان تک بحفاظت لے آنے کا انتظام کر دیں۔ ہم جانتے ہیں کہ پناہ گزینوں کی آبادکاری کا مسئلہ پہلے ہی ہمارے لئے کچھ کم پریشان کن نہیں۔ لیکن جب حالات اس قسم کے ناگزیر ہو جائیں

تو نقصان برداشت کرنے کے سوا چارہ ہی نہیں رہا کرتا۔ جب یہ لوگ بھی ادھر آجائیں گے تو پھر کم از کم اتنا اطمینان تو ہو جائے گا کہ اِدھر آجانے والے مسلمانوں میں اب کوئی "حاطب ابن ابی بلتعہ" نہیں ہے۔

(۲)

پچھلے دنوں جب نواب گرمانی سرگودھا گئے تو وہاں "زمینداران ضلع شاہ پور" کی طرف سے ان کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا جس میں ایک جملہ یہ تھا۔

> اب کچھ وقت سے آئے دن، چند شر انگیز اخبارات کے پراپیگنڈہ سے متاثر ہو کر ہماری سلطنت کے بدخواہ "زمیندار اور مزارعہ" کے سوال کو غیر معمولی اہمیت دے رہے ہیں اور زمینداروں کو ان کے باپ دادا کی اراضی سے محروم کرنے کی فکر میں ہیں۔ بظاہر حکومت نے بھی ایسے غیر اسلامی رجحانات سے متاثر ہو کر کمیشن مقرر کر دیا ہے۔

اسلام بھی دنیا میں بڑا مظلوم واقع ہوا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے سب اسلام کے نام پر ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ جمہوریت بھی عین اسلام ہے اور اس کے خلاف، ہر شخصی بادشاہ کا نام جمعہ کے خطبوں میں لینا بھی عین اسلام۔ غلامی کا مٹانا بھی اسلام کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اور اس کے خلاف مکہ کی گلیوں میں غلام اور لونڈیوں کو نیلام کرانے والی حکومت بھی عین اسلامی حکومت ہے ہوس رانیوں اور عیش پرستیوں کو بند کرنے والا بھی اسلام ہے اور ایک ایک ہوس پرست کے محلات میں ہزار ہزار کنیزوں کی اجازت دینے والا بھی اسلام۔ عورت اور مرد کو مساوی حیثیت دینے والا بھی اسلام ہے اور عورتوں کو بکسر مردوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے والا بھی عین اسلام! آج چونکہ عہد اقتصادیات (Age of Economics) ہے۔ اس لئے زمینداروں سے زمینیں چھین کر مزارعوں کو دینے کی تحریک بھی اسلام اور زمینداروں کا اپنے باپ دادا کی زمینوں پر سانپ بن کر بیٹھے رہنا بھی اسلام! نہیں اس سے بھی آگے بڑھئے۔ زمینداروں کی زمینداریاں اور جاگیرداریاں ختم کرنا بھی عین اسلام اور بڑے بڑے عظیم القدر کارخانوں کا مالک بن کر سرمایہ پرستی کی قاردنیت کا قیام و دوام بھی عین اسلام!

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم نے، اپنے مذہب کے ساتھ ایسا مذاق کم کیا ہو گا جیسا مذاق مسلمانوں نے خدا کے اس زندہ و پائندہ قانون کے ساتھ کیا ہے جس پر اس کائنات کا تمام سلسلہ، اس نظم و ضبط کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس خدا کے قانون کے ساتھ جس نے اعلانیہ کہدیا تھا کہ ولا تجعلوا اللہ عرضۃ لایمانکم۔ اپنی قسموں میں خدا کے نام کو ڈھال نہ بناتے رہو۔ جو غیر اسلامی کام کرنا چاہتے ہو اپنے نام سے کرو۔ اسلام کو کیوں درمیان لاتے ہو! لیکن مسلمان یہی کچھ کرتا چلا آرہا ہے۔ اور اس کا نتیجہ؟

اللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ۔ خدا کا محکم قانون ان کی ہنسی اڑا رہا ہے اور یہ دنیا میں ذلیل و خوار اور حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ کبھی اس کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے ہوئے اور کبھی اس کے سائے میں پرورش کا سامان تلاش کرتے ہوئے۔ ایں سو ماندہ و آں سو در ماندہ۔ وذالک خسران المبین۔

سابقہ اشاعت میں ہم نے ضمناً ذکر کیا تھا کہ قوم کے بچوں کو چونکہ خالص غذا میسر نہیں آرہی اس لئے ان کی صحت دن بدن گرتی چلی جارہی ہے اور خطرہ ہے کہ اگر صورتِ حالات کچھ عرصہ کے لئے اسی طرح رہی تو رفتہ رفتہ ہماری آیندہ نسل ختم ہوجائے گی۔ اس ضمن میں ہمارے علم میں ایک ایسی بات آئی ہے جس کا تذکرہ ناگزیر ہے۔

بناسپتی گھی کے متعلق عام طور پر معلوم ہے کہ انسانی صحت پر اس کا اثر صحت مضر پڑتا ہے لیکن آپ کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ اس بناوٹی گھی میں بھی ردی کچھ ملایا جاتا ہے جو ان کے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ آپ نے وہائٹ آئل (White Oil) کا نام سنا ہوگا۔ یہ مٹی کے تیل کی ایک قسم ہے جس میں نہ رنگ ہوتا نہ بو۔ عام طور پر سر میں لگانے کے ناقص قسم کے تیل اور خوشبوئیں اسی سے مرکب ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی زندگی کے لئے یہ زہر کا حکم رکھتا ہے۔ تیلوں اور خوشبوؤں میں اس کی جس قدر کھپت ہوسکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ تشکیل پاکستان کے بعد اس کی درآمد حدِ تصور سے بھی بڑھ گئی ہے۔ حیرت تھی کہ بالآخر اس قدر وہائٹ آئل خرچ کہاں ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ دراز تک جاری رہا۔ تا آنکہ مزید تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ اس سستے تیل روپی سے کہئے کہ زہر کو گھی اور بناسپتی میں ملا کر مہنگے بھاؤ بیچا جارہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تفتیش کے وقت بعض دوکانداروں کے ہاں تو پچاس فی صدی تک اس کی ملاوٹ نکلی۔ چنانچہ اس کے بعد حکومت پاکستان نے، جون سنہ ۱۹۵۹ء میں جاری کردہ احکام کے ماتحت اس کی درآمد اور نکاس پر پابندیاں عائد کردی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس زہر ہلاہل کے قریب دس لاکھ گیلن ابھی تک مختلف بیوپاریوں کے گوداموں میں دھرے رکھے ہیں۔ یہ مقدار وہ ہے جو کھلے بندوں وہاں موجود ہے۔ پس پردہ مقدار کے متعلق کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ سر میں لگانے والے تیلوں اور خوشبوؤں، یا چھوٹی موٹی ادویات میں جس قدر وہائٹ آئل صرف ہوتا ہے، اس کے اندازہ کے پیشِ نظر یہ مقدار پاکستان میں بیس پچیس سال تک کے لئے مکتفی ہوسکتی ہے۔

اگر یہ درست ہے کہ یہ تیل، قریب دو سال تک پاکستان کے باشندوں کو گھی بنا کر کھلایا جاتا رہا ہے اور یہ فی الواقعہ انسانی صحت کے لئے زہر کا حکم رکھتا ہے تو کیا ہم حکومت پاکستان سے دریافت کرنے کی جرأت

کر سکتے ہیں کہ

(۱) ان کا محکمہ حفظانِ صحت یا کوئی دوسرا محکمہ جو اشیائے خوردنی کی جانچ پڑتال کا ذمہ دار ہے، اتنا غافل کیوں تھا کہ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ یہاں انسانوں کو یہ کچھ کھلایا جا رہا ہے۔

(۲) جب یہ معلوم ہوا کہ اس انسانیت کُش جرم کے مرتکب فلاں فلاں تاجر ہیں تو اُن کے خلاف کیا کارروائی کی گئی۔ یقیناً یہ جرم اس قدر سنگین اور مفاد پرستی کی ایسی خوفناک صورت لئے ہوئے تھا کہ اس کے مرتکبین کو سخت سے سخت سزائیں دی جانی چاہئیں تھیں اور ان سزاؤں کی عام تشہیر کرنی چاہیئے تھی تاکہ عوام اُن کے اس قاتلانہ دھوکے سے آگاہ ہو جاتے اور دوسروں کو آئندہ کے لئے عبرت حاصل ہوتی۔

(۳) حکومت نے اس شاک کو ٹھکانے لگانے کا کیا بندوبست کیا ہے جو ابھی تک ان تاجروں کے گوداموں میں بھرا رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان قارون صفت تاجروں کی ملت خون آشامی، جو محض پیسہ کمانے کی خاطر پوری کی پوری قوم کو اس طرح غیر محسوس طور پر زہر خورانی (Slow Poisoning) کے قبیح و شنیع جرم کے ارتکاب سے نہیں شرماتے، انہیں ہزار ترکیبیں سجھا دیگی جس سے وہ باقیماندہ (ظاہر اور پوشیدہ) شاک کو پھر قوم کے خون تک پہنچا سکیں اور اس سے اپنے شجرۃ الزقوم کو تر و تازہ رکھ سکیں۔

(۴) اور آخر میں یہ کہ اب حکومت نے کیا انتظام کیا ہے جس سے اطمینان ہو سکے کہ قوم کی اشیائے خوردنی خالص صورت میں میسر آ رہی ہیں اور ان میں تباہیوں اور ہلاکتوں کے اجزاء نہیں ملائے جاتے۔

یاد رکھئے کہ قوم کی صحت کا مسئلہ بہت بڑا بنیادی مسئلہ ہے۔ جس قوم نے دنیا میں اپنا معاشی مسئلہ حل نہیں کیا، فطرت کے اٹل قوانین نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا۔ یہ فلسفیانہ موشگافیاں اور منطقیانہ نکات آفرینیاں، یہ جذباتی ہیجان انگیزیاں اور تخیلاتی رنگ آمیزیاں، حتیٰ کہ یہ سیاسی مہرہ بازیاں اور ملکی عقدہ کشائیاں، سب فریبِ نفس ثابت ہو جاتی ہیں اگر قوم کا معاشی نظام ناہموار رہ جائے۔ معاشی نظام کی ہمواری کے لئے ضروری ہے کہ مملکت کے ہر متنفس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی اس طرح پوری ہوتی رہیں کہ وہ ہر فرد کے لئے ممدِ حیات اور ممدِ توانائی ہوں۔ جس قوم کے افراد تندرست و توانا نہ ہوں گے وہ قوم مصائبِ زندگی میں کبھی حوادث کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ یاد رکھئے معاشی نظام کی صالحیت "دنیا داری" کی "مادہ پرستی" نہیں جسے ہمارے مُلّا کی ناعاقبت اندیشی نے مسلمان پر حرام قرار دے رکھا ہے۔ یہ دینِ مبین کا ایک اہم بازو ہے جس کی کمزوری سے اس کا شہبازِ تمکن، زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک کبھی نہیں اُڑ سکتا۔ اسلام شرفِ انسانیت کے ارتقا کا جو پروگرام لے کر آیا ہے، اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کے معاشی جسم کو مستقل اقدار سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ لہٰذا اگر اس میں وہ چیزیں حرام ہیں جو روحانیت کے لئے مضر ہیں تو وہ بھی اسی طرح حرام ہیں جو صحت و توانائی کے لئے ضرر رساں ہیں۔ ان دونوں میں فرق کرنا وہ ثنویت (DUALISM) ہے جسے اسلام مٹانے کیلئے آیا تھا۔

شخصیت پرستی

پرویز

اسلام کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان براہِ راست تعلق پیدا کرے۔ ایسا تعلق کہ عبد و معبود کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ نہ رہے۔ ان کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ ہو۔ اور اس طرح انسان، کہ جسے فطرت نے آزاد پیدا کیا تھا، ساری دنیا کی غلامی سے نجات پا کر، صحیح معنوں میں آزادی حاصل کرلے۔ نبی اکرمؐ تشریف لائے اور اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے بتادیا کہ اس بلند ترین تخیل، اس زریں نصب العین کو کس طرح عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضورؐ کا مشن ان شاندار الفاظ میں بتایا گیا:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ وَوَيْلٌ لِّـلْمُشْرِكِيْنَ ۝

کہو کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے تمہارا الٰہ ایک ہی ہے۔ پس اسی کی طرف سیدھی راہ اختیار کرو اور اس سے مغفرت مانگو۔ اور مشرکین کے لئے بڑی ہی خرابی ہے۔

اور اسی کی تفسیر تھی جو پیکر اسلام جناب عمرؓ نے وادی ضجنان میں گزرتے وقت فرمایا۔ "اللہ اکبر! یہ وہ وادی ہے جس میں ابن خطاب اونٹ چرایا کرتا تھا اور باپ کی سخت گیری برداشت کیا کرتا تھا۔ اور آج اس رب العزت کا اتنا فضل ہے کہ عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہیں"۔ اس سے مراد محض سلطنت و حکومت کی طاقت ہی نہ تھی بلکہ ہر وہ طاقت جو انسان کے قلب و دماغ پر مستولی ہو کر اس کے اور اس کے خدا کے درمیان حاجب و دربان بن جاتی ہے۔

لیکن ہر دقیق نظریہ کی طرح یہ نظریہ تھا بڑا لطیف اور ہر حقیقت عظمیٰ کی مانند یہ حقیقت تھی بڑی غیر محسوس۔ محسوسات کا خوگر انسان، کہ جس کے سجدہ ہائے جبین نیاز لبیطے سے بسیط حقیقت مجردہ کو بھی لباس مجاز میں دیکھنے کے لئے رقصاں و جنباں رہتے ہیں، اس غیر محسوس تعلق سے زیادہ عرصہ تک کیف اندوز نہ ہوسکا اور اس نے وہ تمام پردے ایک ایک کر کے پھر سے گرا لیے جو اسلام سے پیشتر اس کے اور اس کے خدا کے درمیان حائل تھے اور جنہیں نبی عربیؐ نے ایک ایک کر کے اٹھا دیا تھا۔ قرآن کریم نے بڑی شرح و بسط سے ان تمام مقامات کو ایک ایک کر کے گنا دیا تھا جہاں سے یہ پھسنے قلب

دماغ اور سمع و بصر پر گرا کرتے ہیں۔ لہٰذا جب تک قرآن حمید آنکھوں کے سامنے رہا کسی کی مجال نہ ہوئی کہ ان پردوں کو پھر سامنے لاسکے کہ چراغ کا روشن ہونا ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ اندھیرا وہاں نہ آسکے۔ لیکن جب قرآن مہجور ہوگیا، جب بنی اسرائیل کی طرح اس نورِ مبین کو پس پشت ڈال دیا گیا، تو وہی کچھ ہوا جو ہوتا چلا آتا تھا۔ کہ فطرت کے قوانین اٹل اور اس کا دستور غیر متبدل ہے۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۝ آیئے، ان مختلف پردوں اور ان کے حسین و جمیل نقش و نگار کو ایک نظر دیکھیں جو عقیدت و ارادت کے رنگوں سے مزین اور اطاعت و متابعت کے جواہر سے مرصع ہیں۔ اس لئے کہ جب تک آپ ان نظر فریب پردوں کی اصلیت سے واقف نہ ہو جائیں گے اس حقیقت عظمیٰ تک نہیں پہنچ سکیں گے جو صدیوں سے اُن کے اندر لپٹی ہوئی ہے اور بے نقاب ہو کر جنت نگاہ نہیں بن سکی۔

رسول پرستی!

خدا کے بعد ماننے والوں کے نزدیک ہمیشہ رسول کی ہستی اشرف ترین مخلوق ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر انسانوں میں سے کسی کو خدا کی جگہ دی جا سکتی ہے تو سب سے پہلے وہ رسول ہی کی ہستی ہو سکتی ہے۔ امم سابقہ کی روش اس باب میں جو کچھ رہی ہے اس پر قرآن تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ فطرتِ انسانی کے اس کمزور پہلو سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس طرح حضرات انبیاء کرامؑ خدا بنائے گئے یا اس کے بیٹے قرار دیئے گئے۔ الوہیت و ابنیت کی مقدس چادر اڑھا کر انہیں مافوق البشر منایا گیا۔ قرآن کریم اس خطرناک پر دروازہ کو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں سے بند کرنا چاہتا تھا۔ آپ کسی سورت کو دیکھئے۔ لفظاً، معناً، مجملاً، تفصیلاً اس غلط عقیدہ کے ہر گوشہ کی تردید اس میں موجود ہوگی۔ یعنی قرآن کریم میں جس وجہ خدا کی توحید پر مختلف عنوانات سے زور دیا گیا ہے اسی وجہ رسولوں کی بشریت بھی متنوع اعتبارات سے بے نقاب کی گئی ہے۔ انہیں بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہا گیا۔ انہیں خدا کا عبد کہا گیا۔ وہ ہدایت بھی کرتے تھے تو اپنے مالک حقیقی کے حکم سے ہی کرتے تھے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱/۷۳)

اور ہم نے ان کو امام و پیشوا بنایا جو لوگوں کو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔ اور ہم نے ان کو نیکی کرنے، نماز قائم کرنے، اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ سب ہماری عبودیت انجام دیتے ہوئے تھے۔

وہ خود خدا کے دروازے کے بھکاری ہوتے تھے۔

فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (۲۸/۲۴)

اور موسیٰ نے کہا کہ پروردگار آپ جو کچھ بھی بہتری میرے لئے بھیجیں میں اس کا محتاج ہوں۔

انہیں اپنی ذات تک کے لئے نفع و نقصان کا اختیار نہ ہوتا تھا۔

تم کہدو کہ میں اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے۔ اگر میں غیب کے اُمور سے واقف ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مضرت مجھ پر واقع نہ ہوتی۔ میں تو صرف ایمان والوں کے لئے نذیر و بشیر ہوں۔ (۷/۱۸۸)

جو وحی ان پر نازل ہوتی تھی وہ خود اس پر ایمان لاتے تھے وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ اور اس کی اتباع کرنے پر اسی طرح مامور تھے جس طرح اور ماننے والے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ ہر چند وہ اطاعت و انقیاد کے اس بلند مقام پر تھے کہ ان سے احکام الٰہیہ سے سرکشی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بایں ہمہ ان کی بشریت و عبودیت کو پختہ ترین طریق پر واضح کرنے کے لئے یہاں تک بھی فرما دیا کہ بفرض محال اگر یہ بھی شرک و معصیت کریں تو اُن پر بھی اسی طرح عذاب ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں پر۔ بلکہ ان پر عام لوگوں سے دُگنا عذاب ہوگا۔

اگر (بفرض محال) ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو تم اُن کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے اور اس صورت میں ہم تمہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دُگنا عذاب دیتے، اور کوئی ہمارے خلاف تمہارا مددگار نہ ہوتا۔ (۱۷/۷۵)

کفار اعتراض کرتے کہ رسول بھی ہمارے ہی جیسے انسان کیوں ہوں۔ لیکن قرآن بار بار اس بات پر زور دیتا کہ ہاں وہ انسان ہی ہیں اور انہیں انسان ہی ہونا چاہیئے تھا۔ وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

اور کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے۔ (۲۵/۷)

جواب ملتا ہے کہ

ہم نے تم سے پہلے بھی جتنے رسول بھیجے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے (۲۵/۲۰)

اور پھر عام انسانوں کی طرح، اپنے وقت پر مدت حیات ختم کر کے اس دنیا کو چھوڑ جاتے تھے:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاْئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ

اور ہم نے تم سے پہلے کسی بشر کے لئے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا۔ پھر اگر تم وفات پا جاؤ گے تو کیا ہمیشہ رہیں گے۔

البتہ اُن کی بصیرت حقائق و معارف کے اس اُفق اعلیٰ پر ہوتی ہے جہاں عام انسانوں کی نگاہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اُن کے مزکّی و مقدس نفوس کی بلندیاں کائنات کے اس معراج کمال پر ہوتی ہیں، جہاں عام انسانوں کا شہپر تخیل بھی جلتا ہے۔ اُن کے قلب و دماغ کی یہ بلندیاں اپنی نظیر آپ ہوتی ہیں

بایں ہمہ وہ ہوتے انسان ہی ہیں، بشریت کی حدود سے خارج نہیں ہوتے۔ خدا کے عبد ہی ہوتے ہیں، خود معبود نہیں ہوتے۔ اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے وہ اس لئے نہیں آتے کہ انسانوں کو اپنی غلامی اور عبودیت سکھلائیں، بلکہ اس لئے کہ اپنی تعلیم و عمل سے انسانوں کو خدا کی ایسی محکومیت سکھائیں کہ جس سے تمام دنیا کی غلامی کے طوق و سلاسل اتر جائیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ○ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ خدا اسے کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ یہی کہے گا کہ تم اللہ والے بن جاؤ اس کتاب (کی اتباع) کے ذریعے جسے تم دوسروں کو سکھاتے بھی ہو اور خود پڑھتے بھی ہو۔

حضورؐ خاتم النبیین ہو کر تشریف لائے اور اس مقصد رسالت کو اس انداز سے پورا کیا کہ دین اپنی مکمل شکل میں امت کے پاس آ گیا۔

لیکن ذرا غور کیجئے کہ مسلمانوں نے اپنے رسول کے ساتھ کیا کیا۔ کیا وہی نہیں جس سے روکنے کے لئے حضورؐ تشریف لائے تھے۔ "یا احمد بے میم" (احد) اور "بہ عرب بلا عین" (رب)، یہاں تک کہ

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفےٰ ہو کر

وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد تھا کہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں بلکہ خدا کے محتاج ہیں، انہیں تمام دنیا کے نفع و نقصان کا مالک و مختار قرار دے دیا۔ انہیں معاذ اللہ خدا بنا دینا نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا کے عبد کو خدا کہنا عجیب توحید ہے۔ جب اعتراض کیا جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ صہبائے عشق و محبت کی سرمستیاں ہیں۔ انسان سب کچھ اپنے محبوب ہی کو سمجھتا ہے۔ عوام کے جذبات عقیدت کو جوش میں لانے کے لئے تو یہ جواب مؤثر نظر آتا ہے۔ لیکن سوال صرف اتنا ہے کہ امم سابقہ نے جو اپنے رسولوں کو خدا بنا لیا تھا تو کیا بغض و عناد کی بنا پر بنایا تھا؟ وہاں بھی یہی غلوِ محبت ہی تو تھا جس نے ان کے محبوب کو وہ کچھ بنا دیا جسے قرآن کریم نے شرک قرار دیا۔ بغض و عناد اور نفرت سے کبھی کسی نے رسولوں کو خدا نہیں بنایا۔ تو کیا پھر یہ دلیل مضحکہ انگیز نہیں کہ جو کچھ پہلی امتوں نے کیا وہ شرک تھا، اور اگر وہی کچھ اسی جذبے کے ماتحت مسلمان کریں تو عین توحید! ایک ہی بیج اور ایک ہی درخت سے دو مختلف پھل لینا فطرت کا مذاق اڑانا ہے۔ اس میں کیا کلام ہے کہ حضورؐ کی محبت ایک مسلمان کے لئے متاعِ حیات ہے، ایسی محبت جو ماں باپ، اولاد، اموال، بلکہ خود اپنی جان کی محبت سے بھی زیادہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک محبت نہ ہو اتباع کا

ہو نہیں سکتا۔ جس عمل کی محرک آتشِ عشق ہو اس کا ایک لمحہ سو سال کے ٹھنڈے پانی سے وضو کردہ ستر نمازوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے کہ یہ صرف سر جھکاتا ہے اور وہ سر کٹاتا ہے۔ یہ زندہ رہنا چاہتا ہے کہ موت کے بعد کا کھٹکا مٹ جائے اور وہ مرتا ہے کہ زندگی کسی پر سے بچ در ہو کر ٹھکانے لگے۔ ایسے ہی حشر نشر، حساب، کتاب کے جھگڑے درپیش ہوتے ہیں اور اس کی یہ حالت کہ تمیز ہی نہیں کیا جا سکتا کہ تلوار گب جالیا سے پہلے چھوٹی تھی، یا جان بابِ جنت سے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں (اقبالؒ)

لیکن صہبائے عشق کی سرمستیوں میں حفظِ مدارج و مراتب بھی قرآن ہی نے سکھایا ہے۔ جو پی کر بہک گیا وہ میخانۂ یثرب کا متوالا ہی نہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جنّت کی شراب میں سب کچھ ہے لیکن سُکر نہیں ہے؟ لہذا، خدا خدا ہے اور رسول رسول۔ اور رسول کا رتبہ یہی ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس سے آگے بڑھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اس سے پیچھے ہٹنا کہ اسلام لانے کیلئے جہاں خدا کے لئے لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کی ضرورت ہے وہاں محمد کے لئے عبدہٗ و رسولہٗ کی شہادت کی بھی۔ اور یہی ایمان و محبت کی صحیح تصویر ہے۔ اس تصویر کے صحیح رُخ کے لئے دورِ رسالتؐ اور صحابہ کبارؓ کا طرزِ عمل دیکھئے۔ حضورؐ کی عمر بھر یہی تعلیم و تلقین رہی کہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بلند حیثیت نہ دیں اور اپنے ماننے والوں کے قلب و دماغ پر خدا بن کر نہ چھا جائیں۔ اس کے لئے حضورؐ نے ان میں حریتِ فکر و نظر کی ایسی روح پھونکی کہ آج اس مزعومہ جمہوریت کے دور میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ معاملات میں مشاورت۔ صحابہؓ کا کسی ایک موقع پر حضورؐ کی رائے سے اختلاف اور اختلاف کی کامل آزادی، حضورؐ کی رائے کے متعلق یہ تحقیق و استفسار کہ آپ نے وہ رائے بالحکم بمنصبِ رسالت دی ہے یا ذاتی حیثیت سے، یہ سب اس چیز کا آئینہ دار ہے کہ حضورؐ ایک عبدِ مومن میں کس درجہ انسانیت کی آزادی پیدا کرنا چاہتے تھے اور ایک کا غلام بنا کر کس طرح دنیا بھر کی غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ یہی تھا وہ ماحول جس میں عقلِ انسانی نے صحیح نشو و نما پائی۔ اور جب انسان کو خدا نے اس طرح پیدا کیا تھا کہ وہ حیوان کی طرح سر جھکا کر نہ چلے وہ فی الحقیقت اس قابل ہو گیا کہ دنیا میں سر اٹھا کر چلے۔ اسلام، انسان کو یہی سربلندیاں اور سرفرازیاں بخشنے آیا تھا اور یہی اس دینِ فطرت کی خصوصیت تھی۔ ہم نے جب یہ خصوصیت کھو دی تو پھر وہیں جا گرے جہاں سے اُبھرے تھے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ کس قدر صحیح حقیقت ہے۔

پھر اسے بھی سوچئے کہ "محبت رسولؐ" سے مفہوم کیا ہے؟ یہ مفہوم قرآن نے خود متعین کر دیا ہے۔ جب نبی اکرمؐ خود موجود تھے تو بہ حیثیت مرکزِ ملت آپ کی اطاعت فرضِ اولین تھی۔ اور اطاعت

ایسی کہ ایک مستبد اور جابر حاکم کے احکام کی اطاعت نہیں بلکہ دل کے جھکاؤ کی اطاعت۔ اس لئے کہ یہ اطاعت، حضورؐ کی ذات کی اطاعت نہ تھی۔ احکام خداوندی کی اطاعت تھی، جن پر آپ خود بھی عمل کرتے تھے اور اُمت سے بھی عمل کراتے تھے۔ اور احکام خداوندی کی اطاعت، انسان کی اپنی فطرت صحیحہ کے تقاضوں کی تسکین ہے۔ لہٰذا اس میں جبر کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ جس اطاعت میں دل کی خوشی شامل ہو، اس کو محبت کہتے ہیں۔ آج رسول اللہ سے محبت کا مفہوم ہوگا قرآنی نظام کی اطاعت اور ایسی اطاعت جو بطیب خاطر کی جائے۔

یہ ہے محبت کا صحیح مفہوم۔ نہ یہ کہ حضورؐ کے سرو قامت اور گیسوئے خمدار کی تعریف و توصیف میں نعتیہ غزلیں گائی جائیں یا رسول، کو اٹھا کر خود خدا کی مسند پر بٹھا دیا جائے۔ اول الذکر وہ "شاعری" ہے جس سے قرآن نے منع کیا ہے اور ثانی الذکر وہ شرک جس کا تصور بھی ایک توحید پرست نہیں کر سکتا!

ائمہ پرستی رسولوں کے بعد عوام کی عقیدت کے مرکز مذہبی پیشوا اور دین کے ائمہ ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اُمم سابقہ کے کوائف و حالات سے ہمیں بتا دیا کہ رسولوں کے بعد یہی لوگ ہیں جن کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱)

ان لوگوں نے خدا سے ہٹ کر اپنے مذہبی علماء و پیشوایان دین کو خدا بنا لیا۔

اس کے متعلق جب نبی اکرمؐ سے عرض کیا گیا کہ حضورؐ! یہود و نصاریٰ کبھی اپنے احبار و رہبان کو سجدے تو نہیں کیا کرتے تھے تو حضورؐ نے فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس چیز کو حلال نہیں سمجھتے تھے جسے وہ حلال بنا دیں اور اسے حرام سمجھتے تھے جسے وہ حرام کہہ دیں؟ یہی "ارباباً من دون اللہ" بنانا ہے یعنی جو منصب و حیثیت خدا کے لئے ہے وہ ان لوگوں کو دیدیں۔ یہی اُن کی پرستش ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ مذہب کی پرستش یہ ہے کہ

(۱) ان کے فیصلوں کو خدا کے فیصلوں کی جگہ دیدی جائے اور

(۲) اُن کے ارشادات کو تنقید سے بالاتر سمجھا جائے۔

اُمم سابقہ نے یہ کچھ اس لئے کیا تھا کہ اُن کی آسمانی کتابوں کے اجارہ دار و محافظ اُن کے مذہبی راہنما تھے اور لوگ رشد و ہدایت کے لئے اُن کے محتاج تھے۔ چاہیئے یہ تھا کہ لوگ اُن کے فیصلوں کے لئے کتاب کی سند مانگتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ جو کچھ اُن کے اراکین مذہب نے کہہ دیا اسے فرمودۂ الٰہی سمجھ لیا۔ ظاہر ہے کہ عوام اُن کے فیصلوں کو اسی لئے خدا کا فیصلہ سمجھتے تھے کہ اُن کے نزدیک وہ فیصلے خدا کے احکام کے مطابق ہوتے تھے، یعنی وہ ایسا باور کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ لوگ خدا کے فیصلوں سے بے نیاز ہو گئے اور ان ہی احبار و رہبان کو خدا کا قائم مقام سمجھ لیا۔ اب اُن کا ہر حکم وحی منزل

کی طرح واجب التسلیم اور ان کا ہر فیصلہ آیت الٰہی کی طرح بالا از تنقید قرار دیا گیا۔ اسی کو قرآن کریم نے شرک قرار دیا ہے۔

قرآن کریم نے فرمایا:

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (۳)

ہدایت وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے۔

لہذا قرآن ہی کی اتباع واجب ہوئی۔ پھر:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو واضح، مفصل اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا کہ اس کے سمجھنے کے لئے برہمنوں کی کوئی خاص جماعت ہی مختص نہ ہو جائے۔

قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اللہ نے لے لی کہ قیامت تک اس میں نہ رد و بدل ہو سکے نہ ترمیم و تنسیخ۔

ان بدیہیات سے ظاہر ہے کہ دین کا تقاضا ہے کہ ہر زمانہ کے مسلمان قرآن کریم کی روشنی کے ماتحت عقل و سمجھ سے کام لے کر صراط مستقیم پر چلتے جائیں، خود بخود منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ان کو راستہ میں اندھوں کی طرح لاٹھی کی ضرورت ہی نہیں، کہ روشنی بھی موجود ہے اور بینائی بھی۔ لیکن غور سے دیکھئے کیا ہم واقعی اس روش پر چل رہے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑ دیجئے کہ اول تو وہ قرآن کریم کا مصرف بجز اس کے نہیں جانتے کہ یہ قسم اٹھانے کے کام آتا ہے۔ اور اگر ان میں سے بعض قرآن پڑھتے بھی ہیں کہ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ۔ وہ صرف الفاظ کی تلاوت کرتے ہیں۔ خواص کہ جو مذہب کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ کسی معاملہ کے متعلق دینی فیصلہ پوچھئے یہی کہیں گے کہ فلاں امام نے اس کے متعلق یہ فرمایا ہے، فلاں علامہ کی یہ رائے ہے، نسفی میں ایسا لکھا ہے، شارح وقایہ کا یہ خیال ہے۔ غرضیکہ ان کی سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رہ جائے گی اس سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ کہیں خدا کا نام نہیں کسی جگہ قرآن کا ذکر نہیں۔ اور اعتراض کیجئے تو جھٹ کہہ دیں گے کہ میاں! ان حضرات (علیہم الرحمۃ) نے بھی تو قرآن پڑھ کر ہی ایسا لکھا ہے۔ ان سے بڑھ کر اور کون قرآن کو سمجھ سکے گا؟ غور فرمائیے! اس جواب میں اور اس میں جو یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان کے متعلق دیتے تھے کیا فرق رہ جاتا ہے۔ کیا انہوں نے ان کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہی کچھ سمجھ کر نہیں بنایا تھا؟

معاملہ یوں ہوا کہ جب اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو سلطنت کو لامحالہ تدوین قانون کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اسلام میں چونکہ دین و دنیا الگ نہیں اس لئے یہ قانون بھی مذہب ہی کی روشنی میں مرتب ہونا تھا۔ دین کی سمجھ رکھنے والے حضرات جمع ہوئے اور وقت کی ضروریات کو سامنے رکھ کر قانون کے

ضابطہ مرتب کئے۔ یہ ضابطے سرکاری توثیق سے مستند کر کے عدالتوں میں بھجوا دیئے گئے کہ مقدمات کے فیصلے ان ہی کے مطابق ہوا کریں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی آئینی حکومت کے ضوابط قانون مرتب ہو کر نافذ العمل ہو جائیں تو پھر سوائے حکومت کے اور کسی کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ قانون مرتب کر سکے یا اُن میں ترمیم و تنسیخ کر سکے۔ بعینہٖ جس طرح سرکاری ٹکسال کے بعد کسی کو سکہ رائج الوقت بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ بھی فقہ کی ابتدا اور یوں دوسروں کو ایک ہی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے پر مکلف اور اس میں کمی بیشی یا ردّ و بدل کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) نہ تو حضرات فقہا قیامت تک کا علم رکھتے تھے کہ ہر زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق ایک ہی وقت میں مکمل قانون وضع کر دیں۔

(۲) نہ وہ (نعوذ باللہ) خدا ہونے کا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ استنباط مسائل میں اپنے نتائج کو تنقید سے بالاتر قرار دیدیں۔

زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان قوانین میں تبدیلی کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اور اس قانون پر کسی معیار اعلیٰ (قرآن کریم) کی روشنی میں تنقید بھی کی جا سکتی تھی۔ لیکن سلطنت نے جس بنا پر دوسروں کو قوانین میں ردّ و بدل کرنے (بالفاظ دیگر مزید اجتہاد) سے روکا تھا وہ علت تو نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور بعد میں آنے والوں نے سمجھ لیا کہ بس اب تدبر و تفکر کا دروازہ باب نبوت کی طرح بند ہو گیا۔ قرآن جتنا سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا۔ اس سے جو کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا حاصل کر لیا گیا۔ اب اس کا وجود تبرکاً دنیا میں رہے تو رہے عملی حیثیت سے امت اس سے بے نیاز ہو چکی۔ اب اس کے پڑھنے سے ثواب تو ضرور ملتا ہے لیکن اس کا سمجھنا دین پر اضافہ کرنا ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ قرآن حکیم جیسی زندہ اور زندگی بخش کتاب منتروں کا مجموعہ بن کے رہ گئی۔ جس سے جھاڑ پھونک اور گنڈہ تعویذ کا کام لیا جا سکے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی ادبی اور لسانی لطافتوں پر بحث کر کے اسے الفاظ کا گورکھ دھندا سمجھ لیا جائے۔ کیا یہی تھی وہ غرض جس کے لئے قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی تھی؟

تدوین فقہ کا تعلق معاملات کی دنیا تک ہی تھا۔ اگر باب اجتہاد بند ہونا ہی تھا تو وہ اسی حصہ تک بند ہوتا۔ لیکن آہستہ آہستہ دین کے قصر مشید کا ہر ایک دروازہ اور کھڑکی بند کر دی گئی۔ حقائق و معارف پر بھی اسی تقلید کے بادل چھا گئے۔ حتیٰ کہ نوبت بایں جا رسید کہ دین سے قطع نظر دیگر علوم و فنون میں بھی جو کچھ سلف نے لکھ دیا قول فیصل اور حرف آخر سمجھ لیا گیا۔ اب زمانہ کچھ کہے، آپ کی بصیرت کا تقاضا کچھ ہو، آپ نہ اس کے خلاف کچھ کہہ سکتے ہیں جو کہا جا چکا ہے، نہ اس سے زیادہ کچھ سمجھ سکتے ہیں جو سمجھا جا چکا ہے۔ آپ کے سر میں نہ دماغ اپنا ہو سکتا ہے نہ سینے میں آپ کا دل اپنا۔ نہ دیکھنے کے لئے آپ کی آنکھیں نہ سننے کے لئے کان۔ اولٰئک کالانعام بل ھم اضل۔ دنیا کہیں سے کہیں

چلی گئی لیکن اُمتِ مسلمہ کی سطحِ فہم و ادراک جو ہزار سال پہلے تھی وہی آج ہے۔

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے اکھڑ گئے :

یہ میری جبینِ نیاز ہے کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

غور تو کیجئے ، کیا یہ سلف کی پرستش نہیں ؛ یہ ان کو احبار و رہبان کی طرح خدا کا درجہ دینا نہیں !! کیا اُن کی نگاہ کو قیامت تک آنے والے واقعات کا مُبصر اور تمام حالات و کیفیات کا واقف سمجھنا اور اُن کے فیصلوں کو تنقید سے بالاتر قرار دینا ، انہیں خدائی صفات کا حامل سمجھنا نہیں !! اللہ تعالیٰ نے اللہ والے (ربانیین) بننے کے لئے قرآن کریم کو ہی معیار قرار دیا تھا (۳/۷۹) ، اس نے تو قرآن کریم کو نازل فرما کر اس کی تبیین و تفصیل بھی اپنے ذمے لی تھی کہ لوگ اس باب میں بھی دوسروں کے محتاج ہو کر اُن کی عبودیت اختیار نہ کریں۔

الٓرٰ ۔ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۔ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ (۱۱/۲)

ایسی کتاب کہ جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف بھی بیان کی گئی ہیں خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے تاکہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبدیت اختیار نہ کرو۔ (اور) میں تم کو اس کی طرف سے آگاہ کرنے اور بشارت دینے کے لئے آیا ہوں۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی غرض کیا بتاتا ہے جو نبی اکرمؐ کے واسطے سے دنیا تک پہنچا - سورۂ جاثیہ کے دوسرے رکوع میں سلسلۂ کلام یوں شروع ہوتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائی ۔ ان کو دیگر اقوامِ عالم پر فضیلت عطا کی اور انہیں دین کی بینات دی گئیں ۔ لیکن انہوں نے علم آ جانے کے بعد باہمی ضد اور ہٹ سے باہمی اختلافات پیدا کر لئے ۔ اُن کے اختلافات کا تو قیامت میں فیصلہ کر دیا جائے گا لیکن دنیا کو تو ضرورت تھی کہ خدا کا وہ دین جو اختلافات کی نذر ہو کر مسخ ہو چکا تھا پھر سے دنیا کو مل جائے ۔ اس کے لئے

ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْہَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَہْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۵/۱۸)

پھر ہم نے تمہیں (اے رسول) دین کی ایک شریعت پر مبعوث کیا ۔ پس اس کا اتباع کرو اور ان لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کرو جن کو علم نہیں ہے۔

یہ دین شریعت کہاں ہے ؟ اس کا جواب بھی دیا ہے۔

ہٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ ہُدًی وَّ رَحْمَۃٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝ (۴۵/۲۰)

(یعنی قرآن) ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے بصیرت ہے اور ایمان والوں کے لئے ہدایت و رحمت۔

قرآن ہر زمانہ کے انسانوں کے لئے بصائر ہے۔ اس میں بار بار غور و فکر، تدبر و تفحص کی تاکید کی گئی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کو کہیں شر الدواب کہا گیا، کہیں کالانعام بتایا گیا۔ جہنم اُن سے بھری گئی، اُن کے قلوب پر مُہریں، اُن کی آنکھوں پر پردے، اور اُن کے کانوں میں ڈاٹ بتائے گئے۔ کہئے جو کتاب اس طرح عقل و بصیرت کو دعوت دیتی ہو اور جس کے لانے والے کا خود دعویٰ یہ ہو

اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ۔

میری اور میرے متبعین کی دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرت ہے۔

اُس کتاب میں کورانہ تقلید کی کہاں گنجائش ہے۔ جمود و تعطل وہ کب روا رکھ سکتی ہے۔ قرآن انسانوں کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لیجانے کے لئے آیا تھا۔ لیکن آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہنے والا تو خواہ ظلمت میں ہو خواہ نور میں یکساں ہے۔ علم، اجتماعی حیثیت سے، قوموں میں وراثتاً منتقل ہوتا اور قومی سرمایہ کی طرح بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن جو قوم علم کی کسی خاص سطح کو منتہائے کمال سمجھ کر فارغ ہو بیٹھے اس کا مآل معلوم۔ چنانچہ وہ قوم جو دنیا میں تمام نوع انسانی کی امامت کے لئے آئی تھی دنیا کے پیچھے پیچھے رہنے کی عادی ہو گئی۔ وہ ملت جس کے ہاتھ میں ایسی عظیم الشان قندیل دی گئی تھی کہ اس کی روشنی مشرق و مغرب کے امتیازات مٹا کر اقصائے عالم کو منور کرنے والی تھی اب ہر جگنو کو شمع راہ سمجھ کر اس کے پیچھے لپکنے کی خوگر ہو گئی۔ یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں سہل انگاری اور آرام طلبی تھی۔ اجتہاد کے لئے ذہنی جہاد اور اس کے ساتھ ساتھ جسمانی مجاہدے کی ضرورت تھی۔ تقلید میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ جس کو بے دادا کے ورثہ سے ریاست مل جائے وہ خود محنت کیوں کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وراثت میں سکہ ان کو وہ ملے جو اصحاب کہف کے سکہ کی طرح صدیوں پہلے کا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تقلید اختیار ہی وہ قوم کرتی ہے جس میں مجاہدانہ روح باقی نہ رہے۔ ہر قوم کی تاریخ ہمیں ایسا ہی بتاتی ہے۔ خود قرآن کریم اس پر شاہد ہے۔

> تم سے پہلے (بھی) کوئی رسول کسی بستی میں نہیں آیا کہ وہاں کے خوش حال (آرام طلب) لوگوں نے یہ نہ کہہ دیا ہو کہ ہم نے اپنے آباء کو ایک طریق پر پایا اور ہم ان ہی کے نشانات کا اقتدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ (۴۳/۲۳)

لیکن یہ یاد رہے کہ اُس مکافاتِ عمل کے دن کہ جب "سمع و بصر و قلب" ہر ایک سے الگ الگ باز پرس ہو گی، آپ یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکیں گے کہ ہم نے فلاں امام کی تقلید کی تھی، فلاں عالم کا اتباع کیا تھا۔ متبوع حضرات آپ کے اس اتباع سے ہی انکار کر دیں گے کیونکہ انہوں نے کبھی کسی کو ایسے اتباع

کا حکم نہیں دیا تھا۔

جس وقت وہ لوگ جو متبوع تھے اپنے متبعین سے بیزار ہو جائیں گے اور سب عذاب
کا مشاہدہ کریں گے ان کے باہمی تعلقات سب منقطع ہو جائیں گے۔ (۲/۱۶۶)

اس وقت متبعین سے پوچھا جائے گا کہ تم نے جو اُن کی پرستش شروع کر دی۔

کیا تمہارے پاس پیغمبر بینات لیکر نہیں آتے رہے! وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تو تھے (۶۷/۹)

اور یہ بھی سمجھ رکھئے کہ مکافاتِ عمل کے ظہورِ نتائج کا دن صرف مرنے کے بعد ہی نہیں آئے گا۔ اس جہانِ سعی و عمل میں، زندہ قوموں کے لئے ہر سانس ظہورِ نتائج کا لمحہ ہوتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر قیامت نمودار ہو رہی ہے۔ لمحہ بہ لمحہ ایک نیا حشر بپا ہوتا ہے۔

ہمارا مطلب یہ نہیں کہ سلف سے جو کچھ تمہارے پاس آیا ہے معاذ اللہ سب گمراہ کن ہے۔ ایسا کون کہہ سکتا ہے! مطلب صرف یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں ان سے ملا ہے آنکھیں بند کر کے اس کی پیروی نہ کرو۔ بلکہ شمعِ قرآنی کی روشنی میں ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھو۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح کے انسان تھے۔ غلطی کر سکتے تھے۔ لیکن قرآن کی کسوٹی کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔ جو اس کسوٹی پر پورا اترے دین وہی ہے، اور بس۔ وَذٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمِ

اسلاف پرستی کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہم تو غلطی کر سکتے ہیں لیکن ہمارے بزرگوں سے غلطی کا امکان نہیں تھا۔ لیکن آپ اس دلیل کو ذرا آگے بڑھائیے تو اس کی حقیقت خود بخود بے نقاب ہو جائے گی۔ یعنی ہم اپنے آپ کو غلطیوں سے منزہ قرار نہیں دیتے۔ لیکن ہمارے بعد کے آنے والے ہمیں اپنا اسلاف سمجھیں گے اور اسلاف سمجھ کر یہ عقیدہ قائم کر لیں گے کہ ان اسلاف سے غلطی نہیں ہو سکتی تھی البتہ ہم غلطی کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا جائے گا۔ یقین مانئے! ہمارے اسلاف بھی ہماری طرح یہی کہتے تھے کہ ہم منزہ عن الخطا نہیں ہیں۔ لیکن یہ بعد کے آنے والے تھے جنہوں نے انہیں منزہ عن الخطاء قرار دے کر ان کے ہر فیصلہ کو وحیِ آسمانی کی طرح تنقید کی حدود سے بالاتر قرار دیدیا۔ امام یوسفؒ کا قول ہے کہ کسی شخص کے لئے ہمارے کسی قول کی اتباع جائز نہیں تاوقتیکہ وہ ہمارے ماخذ کو نہ جان لے۔" امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "جو شخص ہم کو بلا حجت لیتا ہے اس کی مثال رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چننے والے کی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ لکڑی کی جگہ سانپ پر ہاتھ ڈال دے۔" امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ "میں بھی انسان ہوں میری رائے صائب بھی ہوتی ہے اور غلط بھی۔" امام احمدؒ کا قول ہے کہ "انسان کی نا سمجھی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دین کو اشخاص کے ہاتھ میں دیدے۔" وقس علیٰ ذٰلک۔ یہ حضرات وہ ہیں جنہیں اجتہادِ تامہ کا درجہ حاصل تھا۔ جب وہ اپنے آپ کو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے تھے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔ لیکن

جو بعد میں آنے والوں نے انہیں ہر طرح کی خطا، سہو اور غلطی سے معصوم سمجھ کر ان کے اقوال کو پیغام خداوندی قرار دے دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ "چاروں اماموں کے فیصلے کے بعد ہمیں آنکھیں بند کر لینی چاہئیں۔" امام شافعیؒ کی تو یہ کیفیت تھی کہ ایک سال ایک فیصلہ دیتے تھے لیکن دوسرے سال مزید تحقیق کے بعد اسے منسوخ قرار دیتے تھے۔ لیکن ان کے بعد ان ہی ائمہ کی تقلید کرنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "انسانی آراء و اقوال تو ایک طرف، ہر وہ آیت جو ہمارے مسلک کے خلاف جائے یا ماؤل ہے یا منسوخ۔" یعنی قرآن کریم کو بھی ان حضرات کے مسلک کے ماتحت رہنا ہوگا۔ اگر کوئی آیت قرآنی اُن کے مسلک کے خلاف جائے گی تو یا تو اس کی ایسی تاویل کرلی جائے گی کہ وہ اس مسلک کے مطابق اتر آئے اور اگر اس کی ایسی تاویل نہ ہوسکے تو سمجھ لیا جائے گا کہ وہ آیت منسوخ ہے۔ اللہ اکبر! خدا کے احکام انسانی فیصلوں کی رو سے منسوخ قرار دیئے جائیں گے۔

چونکہ مسلمان صدیوں سے تحزب و تشیع، فرقہ بندی اور گروہ سازی کی مشرکانہ زندگی سے گزر رہے ہیں اگرچہ قرآن کریم دین میں تفرقہ اندازی کو صریح الفاظ میں شرک قرار دیتا ہے۔ غور سے دیکھئے تو اس کی تہ میں بھی اسلاف پرستی ہی کا جذبہ کارفرما نظر آئے گا۔ ہونے کو فروعی معاملات میں اختلاف کہاں نہیں ہوتا۔ اصحابؓ اور خود صحابہ کبارؓ میں بعض مسئلوں میں ذاتی طور پر اختلاف تھا۔ حضرات ائمہ کا یہ عالم تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ان رشید امام یوسفؒ و امام محمدؒ سینکڑوں مسائل میں اپنے استاد سے اختلاف رکھتے تھے۔ باایں ہمہ ان ذاتی اختلافات کی بنا پر وہ حضرات کوئی نیا دین، کوئی جداگانہ فرقہ نہیں بنا لیتے تھے۔ لیکن بعد کے آنے والوں نے جب اسلاف پرستی شروع کی اور ایک مخصوص مسلک کے متبعین نے سمجھ لیا کہ ہمارے مسلک کے مؤسس منزہ عن الخطا ہیں تو لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑا کہ اس مسلک کے خلاف چلنے والے بدیہی طور پر غلطی پر ہیں۔ یہی کچھ مخالف مسلک والوں نے سمجھا۔ نتیجہ اس کا بغیاً بینہم، باہمی ضد اور ہٹ کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ اور یہی ضد اور ہٹ ہے جسے قرآن کریم اختلاف آراء اور تفرقہ انگیزی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اور اس کے بعد کل حزب بما لدیہم فرحون کے مطابق ہر شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ جس فرقے سے میں متعلق ہوں وہ "ناجی" ہے اور باقی سب جہنمی ہیں۔ اور ہر شخص کی تمام جدوجہد اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ اپنے فرقہ کو برسرِ حق اور دوسروں کو باطل پر ثابت کرے۔ نہ اس میں تحقیق کا مادہ باقی رہتا ہے، نہ حقائق کو خالی الذہن ہو کر پرکھنے کی صلاحیت۔ وہ اپنے مسلک کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے نہیں کہ اس کے پاس اپنے مسلک کی حقانیت کے محکم دلائل ہوتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اگر اپنے مسلک میں کسی غلطی کا امکان تسلیم کرے تو اس سے اسے اپنے اسلاف میں بھی غلطی کا امکان ماننا پڑے گا۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے تسلیم

کرنے کے لئے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی تیار نہیں۔ اس سے اس کے "دین" کی فلک بوس عمارت زمین پر آگرتی ہے۔

پھر آپ دیکھیں گے کہ یہ اختلافات بہت چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہوتے ہیں۔ ایسی معمولی باتوں میں کہ آپ سنیں تو حیران رہ جائیں کہ یہ کونسا ایسا معاملہ ہے جس پر یوں آستینیں چڑھائی جائیں۔ لیکن ان حضرات کے سامنے چونکہ زندگی کا کوئی صحیح مقصد نہیں، دین کا کوئی واضح نصب العین نہیں اس لئے وہ اختلافات کی ان حدود و بندیوں کی حفاظت ہی کو ذریعۂ نجات سمجھے ہوئے ہیں اور ان کا تحفظ ہی ان کے نزدیک عین جہاد ہے۔ ایک دفعہ دیکھنے میں آیا کہ ایک بہت بڑے مولوی صاحب کا نہایت پرشکوہ جلوس جا رہا ہے — "غازی اعظم زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے فضا مرتعش ہو رہی ہے۔ مسرت کے شادیانے بج رہے ہیں۔ خوشی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان صاحب نے کسی مجلس مناظرہ میں امام ابوحنیفہؒ کی شان میں سوء ادبی کے کلمات کہے۔ اس پر مقلدین حضرات نے ان پر تعدی چلایا۔ مقدمہ نے طول کھینچا، سزا ہوئی لیکن اپیل میں بری ہو گئے اور اب فاتحانہ انداز سے مظفر و منصور چہرے مراجعت فرمائے وطن ہو رہے ہیں۔ آپ ان روح فرسا مناظر کو دیکھ کر بے شک ہنس دیجئے۔ لیکن ان کی اہمیت ان حضرات سے پوچھئے۔ ان کے نزدیک تو عاقبت سنوارنے کا ذریعہ یہی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کہ اسلاف پرستی نے درحقیقت خدا پرستی کی جگہ لے رکھی ہے۔ جو کچھ خدا کے لئے ہونا چاہئے تھا وہ سب اسلاف کی عظمت و عقیدت کے لئے ہو رہا ہے۔

پھر ایک اور بات بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ظاہر ہے کہ فقہی احکامات و مسائل درحقیقت ان قوانین کا نام ہیں، جو اسلامی سلطنت کی طرف سے نافذ ہوتے تھے۔ سلطنت تو ایک مدت ہوئی ختم ہو چکی لیکن ان قوانین کی فرعی اختلافات کی جنگ برابر جاری ہے۔ ان حضرات کی عمریں ان اختلافات سے متعلق بحث و جدل میں گزر جاتی ہے۔ لیکن کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ کیا قوت کے پیدا کرنے کی بھی کوئی تجویز کی جائے جس کی بنا پر ان قوانین و احکام کو منوایا جائے گا۔ اور حق یہ ہے کہ جس قوم کے قوائے ذہنی و عملی پر اس درجہ تعطل و جمود چھا جائے وہ کس مکش حیات سے اسی طرح گریز کیا کرتی ہے۔ اور یہ نفس انسانی کی شعبدہ کاریاں ہیں کہ وہ اس فرار کو بھی جہاد بنا کر دکھا دیتا ہے۔

یہ تو ائمہ فقہ اور علماء سلف کی تقلید و اتباع سے متعلق تھا۔ ائمہ پرستی میں ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے، لیکن وہ ہمارے اس موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے ائمہ حضرات کو معصوم اور مامور من اللہ مانتے ہیں اور اس امامت کو ایک خاندان میں مقید و محدود سمجھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اس قسم کے عقائد کو قرآن کریم کی رو سے نسل پرستی سمجھے اور اس مقصد عظیم کی نقیض جس کے

لئے اسلام آیا تھا، وہ ان حضرات سے کسی کلمۂ مشترک پر افہام و تفہیم کی بات کیسے کرے؟ لہٰذا ان حضرات سے ہمارا تخاطب ہی لاحاصل ہے۔

(۲)

رواۃ پرستی

اس مضمون کی قسط اول میں ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کا نصب العین تو یہ تھا کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کرے۔ لیکن بعد میں مسلمانوں نے کس طرح اپنے اور اپنے خدا کے درمیان مختلف حاجب و دربان مقرر کر لئے اور دین کے راستے میں براہ راست خدا تک پہنچنے کے بجائے راستہ میں "ارباب من دون اللہ" کا دامن تھام کر بیٹھ گئے۔ اس سلسلہ کی پچھلی کڑی میں اس کورانہ تقلید کا ذکر آیا تھا جو ائمہ پرستی کی وجہ سے مسلمانوں میں پیدا ہو گئی۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر اس جامد تقلید کی خرابیوں کا احساس نمودار ہوا، اور ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے اس کی شکست و ریخت کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ یہ کوشش بڑی مبارک تھی لیکن شاید ابھی مسلمانوں کے ابتلاء کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اُن کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ

خواستم پیکاں برآرم۔ در جگر نشتر شکست:

ائمہ پرستی کے کانٹوں سے دامن چھڑانے گئے تھے لیکن خود ایک اور جھاڑی میں الجھ کر رہ گئے۔ یہ "جھاڑی" عقیدت و ارادت کے اس قدر خوشنما اور نظر فریب پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے کہ دامن کو الجھانے والے کانٹوں کو بے نقاب دیکھنا بڑا دقت طلب ہے۔ اس لئے جو کچھ اس خستہ مضمون میں عرض کیا جائے گا اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ ان خیالات کو جو پہلے سے آپ کے قلب و دماغ پر مستولی ہیں تھوڑی دیر کے لئے الگ کر دیجئے اور یوں خالی الذہن ہو کر ٹھنڈے دل سے بنگاہ تفکر و تدبر غور کیجئے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ یہ تاکید اس لئے ضروری سمجھی گئی ہے کہ مسئلہ زیر نظر جس قدر اہم ہے اُسی قدر نازک بھی ہے۔ لہٰذا اہمیت و نزاکت کی اس کش مکش میں قلب و دماغ میں تصادم ناگزیر ہو جائے گا اور اگر آپ ان جذبات کی رو میں بہہ گئے جو فضا میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں تو آپ حقیقت تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ نگہ بصیرت سے بھی کام لیجئے اور دعا کیجئے کہ اَللّٰھُمَّ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔

آپ کسی مسلمان سے پوچھئے کہ دین کس چیز کا نام ہے، وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ "قرآن و حدیث" کا مجموعہ۔ یہ چیز ہمارے دلوں میں اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ کبھی تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ اس کے متعلق بھی کسی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ گویا یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے جو کبھی محل نظر نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی تردد کی گنجائش ہی نہیں۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں، یہ چیز بھی اس قابل ہے کہ اس پر غور و فکر کیا جائے اور سوچا جائے کہ جو کچھ عام طور پر مشہور ہو چکا ہے وہ درحقیقت

ایسا ہے یا نہیں۔ تو اس آواز کے خلاف کس قدر ہنگامہ برپا ہو جائے گا اور مخالفت کی کتنی توپیں ہوں گی جو اس کے مقابل ہجوم کر کے چلی آئیں گی۔ اب اگر آپ اس ہنگامہ و ہو ہو کے شور و غوغا میں کھو گئے تو پھر آپ حقیقت تک نہیں پہونچ سکتے۔ اس لئے آپ کو نہ صرف اپنے داخلی جذبات کے غیر محسوس طوفان ہی کا مقابلہ کرنا ہوگا بلکہ ان خارجی ہنگاموں کے غلغلہ انداز سیلاب کو بھی برداشت کرنا پڑے گا۔ اور حق یہ ہے کہ جب تک اس قدر شدید جدوجہد نہ کی جائے عروسِ حقیقت بے نقاب جلوہ پیرا نہیں ہوتی۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

دین کے متعلق ایک چیز سے تو یقیناً آپ سب متفق ہوں گے۔ یعنی یہ کہ دین وہی ہو سکتا ہے جو یقینی ہو، ظنی اور قیاسی نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ (۱۰/۳۶)

اور ان میں سے اکثر لوگ ظن کے سوائے کسی اور چیز کی اتباع نہیں کرتے۔ یقیناً ظن حق کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ اللہ خوب واقف ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جن دو اجزاء (قرآن اور حدیث) کے مجموعے کا نام دین سمجھا جاتا ہے ان میں سے کوئی ظنی تو نہیں؟ اور کیا یہ دونوں اجزاء اللہ اور اس کے رسول نے دین کی حیثیت سے مسلمانوں کو دیئے ہیں؟

پہلے قرآن کریم کو لیجئے۔ قرآن میں ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں مرتبہ اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب حق ہے۔

وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ ..... (۳۵/۳۱)

جو کچھ ہم نے کتاب سے تیری طرف وحی کیا ہے وہ (بالکل) حق ہے۔ ۔ ۔ ۔

اس کتابِ عظیم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے: ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ یہ کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، یہ سراسر حق ہے، یقینی ہے۔ ظنی اور قیاسی نہیں، ریب و شکوک کی حدود سے بالاتر ہے۔ یہ تو ہے نفسِ کتاب کے متعلق۔ اب رہا یہ یقینی شے مسلمانوں کو ملی کیسے اور اُن کے پاس رہے گی کس حیثیت سے۔ سو ظاہر ہے کہ قرآن کریم حضورؐ پر نازل ہوا اور اس کے متعلق جمع و تدوین کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ (۷۵/۱۷)

یقیناً اس (کتاب) کا جمع کرانا اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اور صرف جمع و تدوین ہی نہیں بلکہ اس بات کی ذمہ داری بھی کہ قیامت تک اس میں کسی قسم کا رد و بدل اور کسی نوعیت کی تحریف و الحاق نہ ہو سکے۔ فرمایا:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۱۵/۹)

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس حفاظت کو عملی شکل دینے کے لئے جناب نبی اکرمؐ کو ارشاد ہوا کہ

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ (۵/۶۷)

اے رسول جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اُسے لوگوں تک پہنچا دو۔

حضورؐ نے اس حکم خداوندی کی تعمیل میں جو کچھ کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔ یعنی صحابۂ کبار کی ایک جماعت تھی جنہیں قرآن کریم کا ایک ایک لفظ لکھوایا جاتا تھا۔ ہزاروں حفاظ تھے جنہیں لفظاً لفظاً یاد کرایا جاتا تھا پھر حضورؐ اُن کا یاد کردہ خود سنتے تھے اور اُن کی تصحیح و تصویب فرماتے تھے۔ چنانچہ دنیا سے تشریف لیجانے سے پیشتر حضورؐ نے کامل اطمینان کر لیا کہ پیغام خداوندی جو آپ پر نازل ہوا تھا وہ اپنی کامل و مکمل شکل میں لوگوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ لکھا ہوا محفوظ ہے اور ہزاروں حفاظ کے سینوں میں مصئون۔ حجۃ الوداع کے عدیم النظیر خطبہ میں حضورؐ نے لاکھوں مسلمانوں کے مجمع سے اس امر کا استقرار لیا کہ آپ نے اس پیغام الٰہی کو ان تک پہنچا دیا ہے۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو اس پر گواہ قرار دیا کہ تو شاہد ہے کہ میں نے اپنا فریضۂ رسالت یوں ادا کر دیا ہے۔ اس انتظام و اطمینان کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سند نازل ہوئی کہ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي۔ (آج کے دن ہم نے دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا۔) نبی اکرمؐ کے بعد خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے حفاظت قرآن کریم کو سب سے بڑا فریضہ سمجھا اور اس کے لئے عملی ذرائع اختیار کئے۔ حضورؐ نے قرآن کریم کو متفرق نوشتوں پر لکھا ہوا چھوڑا تھا۔ حضرت ابا بکر صدیق رضؓ کے عہد خلافت میں حضرت عمر رضؓ کے مشورے سے حضرت زیدؓ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بٹھائی گئی جس نے ان متفرق نوشتوں کی بغیر ادنیٰ ترمیم کے قرآن کریم کو ایک جگہ کتابی شکل میں منضبط کر دیا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اس مصحف اول کی بہت سی نقول مختلف مراکز اسلامیہ میں بھجوائیں جن میں سے کئی ایک نسخے بجنسہٖ صدیوں تک محفوظ چلے آئے۔ اس کے بعد یہ صحیفۂ ربانی آج تک حفاظ کے سینوں میں اور صفحات قرطاس پر اسی التزام سے محفوظ چلا آرہا ہے کہ اپنے تو اپنے غیروں تک کو اعتراف ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو قرآن کریم موجود ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے انہیں دیا تھا۔ اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے اس لئے اس کا یہ آخری پیغام قیامت تک اسی طرح محفوظ رہے گا۔ یہ ہے یقینی چیز جس کے متعلق ذرہ جتنے بھی ظن و قیاس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھئے جسے عام طور پر دین کا دوسرا جزو قرار دیا جاتا ہے، یعنی مجموعۂ احادیث۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ بھی اسی طرح یقینی ہے جس طرح قرآن کریم ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علاوہ اور کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہ تو احادیث کو جمع کیا نہ ان کے جمع کرنے کا حکم دیا اور نہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ خدا کے بعد خدا کے رسول کا اس باب میں کیا طرزِ عمل رہا؟ یہ چیز بھی بڑی غور طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ احادیث نبی اکرمؐ کے اقوال و اعمال و احوال کے مجموعہ کا نام ہے۔ اگر یہ جزوِ دین تھیں تو جس طرح آپ نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو لکھوایا، زبانی یاد کرایا، لوگوں سے سنا، دہرایا اور ہر طرح سے اطمینان فرما لیا کہ اس کا ایک ایک حرف محفوظ کر دیا گیا ہے۔ احادیث کے متعلق بھی یہی انتظام فرمانا چاہیئے تھا۔ حتیٰ کہ منصبِ رسالت کا یہی تقاضا تھا اور بحیثیت رسول حضورؐ کا یہ فریضہ کہ دین کو محفوظ ترین شکل میں اُمت کے پاس چھوڑتے۔ لیکن حضورؐ نے جہاں قرآن کریم کے متعلق اس قدر حزم و احتیاط سے کام لیا احادیث کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا، برعکس اس کے اکثر کتبِ احادیث میں ہی یہ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ (مسلم)

مجھ سے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز لکھی ہو اُسے مٹا ڈالے۔

کہا جاتا ہے یہ حکم عارضی تھا۔ اس لئے کہ بعض روایات سے یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ کی درخواست پر انہیں اجازت عطا فرما دی تھی کہ وہ چاہیں تو احادیث لکھ دیا کریں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا ثابت ہوگا کہ حضورؐ نے اجازت عطا فرمائی تھی اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا تھا۔ پھر اجازت کے بعد یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کبھی کسی سے دریافت فرمایا ہو کہ اس نے کون کون سی حدیثیں لکھی ہیں اور اس سے وہ احادیث سنی ہوں اور ان کی تصحیح یا تصویب فرمائی ہو۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا اس لئے ان کی یادداشت پر بھروسہ کر لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر دین کے معاملہ میں یادداشت پر بھروسہ کر لینا ہی کافی تھا

لہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب تم احادیث کو یقینی نہیں سمجھتے تو ان کو بطورِ دلیل کے پیش کیوں کرتے ہو؟ سو واضح رہے کہ یہ چیز بطورِ دلیل ان کے لئے پیش کی جاتی ہے جو انہیں یقینی مانتے ہیں تاکہ وہ دیکھ لیں کہ خود احادیث بھی ان کے مسلک کے خلاف جاتی ہیں۔ ورنہ جہاں تک ہمارے لئے حجت شرعیہ اور اطمینانِ قلب کا تعلق ہے۔ الحمدللہ کہ اللہ کی کتاب کافی ہے۔ حسبنا کتاب اللہ اس کے بعد تاریخ میں وہ چیزیں جو کتاب اللہ کے مطابق ہوں۔

تو قرآن کریم لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لیے لوگوں کی یادداشت کیوں نہ کافی سمجھی گئی؟ اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم کا تو لفظ لفظ یاد کرایا جاتا تھا اور پھر اُن سے سن لیا جاتا تھا اور اس کی تصدیق فرمائی جاتی تھی۔ اگر کچھ احادیث کسی نے اپنے طور پر یاد بھی کر لی ہوں تو اُمت کے لیے وہ سند نہیں ہو سکتیں، تا وقتیکہ نبی اکرمؐ ان احادیث کو سن کر ان کے مستند ہونے کی تصدیق نہ فرما دیتے۔ اور پھر وہی احادیث قرآنِ کریم کی طرح اپنے اصلی الفاظ میں آگے نہ چلتیں۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں نہیں ہوئی۔ آپ خیال فرمائیے کہ اگر احادیث بھی دین کا جزو ہوتیں تو رسول اللہؐ ان کی حفاظت کا کچھ انتظام بھی نہ کرتے؟

روایات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ، کچھ اور متفرق چیزیں بھی حضورؐ کے ایما کے مطابق قلمبند ہوئی تھیں۔ مثلاً وہ تحریری معاہدات، احکام اور فرامین وغیرہ جو آنحضرتؐ نے قبائل یا اپنے عمال کے نام بھیجے۔ لیکن اس باب میں جو کچھ آج تک معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ حضورؐ کی وفات کے وقت صرف حسب ذیل تحریری سرمایہ موجود تھا۔

(۱) پندرہ سو صحابہ کے نام (ایک رجسٹر میں)

(۲) مکتوبات گرامی جو حضورؐ نے سلاطین و امراء کے نام لکھے۔

(۳) تحریری احکام، فرامین اور معاہدات وغیرہ۔

(۴) کچھ حدیثیں جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ نے اپنے طور پر قلمبند کیں۔

ان احادیث کے متعلق نہ تو کہیں سے یہ ثابت ہے کہ حضورؐ نے ان کی تصدیق فرمائی تھی اور نہ ہی بعد میں یہ اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود رہیں۔ لہٰذا کوئی حدیث بھی ایسی نہیں ہے جو حضورؐ کے عہد مبارک میں لکھی گئی ہو اور وہ اُسی شکل میں ہمارے پاس موجود ہو۔ خود بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرمؐ نے (اُمت کے لیے) کیا چھوڑا ہے، تو آپ نے کہا کہ مَا تَرَكَ اِلَّا مَا بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ۔ یعنی قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ نہیں چھوڑا۔ (بخاری جلد دوم کتاب فضائل القرآن)

حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ کا زمانہ آتا ہے۔ ان برگزیدہ حضرات نے قرآن کریم کی نشر و اشاعت اور حفاظت و صیانت میں جو کوششیں کیں ان کا اجمالی ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اب دیکھئے کہ احادیث کی جمع و تدوین و ترویج و تحفظ میں ان کا طرز عمل کیا رہا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ

حضورؐ کی وفات کے بعد ایک مرتبہ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ تم لوگ رسول اللہؐ سے حدیثیں بیان کرتے ہو اور اس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ تمہارے بعد جو لوگ

آئیں گے ان میں تم سے زیادہ اختلاف پیدا ہوگا۔ اس لئے تم لوگ رسول اللہؐ سے کوئی حدیث بیان نہ کرو۔ جو شخص تم سے حدیث پوچھے اس سے کہہ دو کہ ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام۔

یہی تک نہیں بلکہ اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ بھی تھا لیکن آپ نے اسے یہ کہکر جلا دیا کہ مجھے خوف ہے کہ میں مرجاؤں اور یہ محفوظ رہ جائے۔ ممکن ہے کہ میں نے اس میں ایسے لوگوں سے حدیثیں لی ہوں جن کو میں امین سمجھتا ہوں اور مجھے ان پر وثوق ہو لیکن وہ حدیثیں ایسی نہ ہوں۔

حضرت عمر رضؓ نے تو اس باب میں اور بھی شدت سے کام لیا۔ آپ لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے سختی سے روکتے تھے۔ قرظہ بن کعب راوی ہیں کہ جب حضرت عمر رضؓ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو ہمیں تاکید کردی کہ یاد رکھو کہ تم ایسے مقام پر جاتے ہو جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں، تم ان کو احادیث میں الجھا کر قرآن سے غافل نہ کردینا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اسی طرح حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں بھی حدیثیں بیان کر سکتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں اسی طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے پیٹتے۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ، ابو درداؓ اور ابو مسعودؓ انصاری کو کثرت روایت کے جرم میں قید کردیا تھا (ان تمام روایات کے لئے دیکھو تذکرۃ الحفاظ) ممکن ہے کہ ان روایات کی صحت کو محل نظر قرار دے دیا جائے، حالانکہ ہمارے نزدیک ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ منشائے قرآنی اور عمل رسول اللہ کے عین مطابق ہیں، بایں ہمہ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے نہ ہی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے اس لئے کہ اگر ہمیں یہ داخلی شہادات نہ بھی ملتیں تو بھی ایک حقیقت ایسی ہے جس سے کسی شخص کو مجالِ انکار نہیں اور وہ یہ کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعہ احادیث نہیں ملتا جو ان حضرات نے خود مرتب فرمایا ہو یا اُن کی زیر نگرانی مدون کیا گیا ہو۔ بلکہ حضرت عمر رضؓ کے سامنے تو ایک مرتبہ یہ معاملہ پیش بھی کیا گیا کہ احادیث کو لکھ لیا جائے۔ حضرت عمر رضؓ نے کامل ایک ماہ تک اس معاملہ میں استخارہ کیا لیکن اس کے بعد فرمایا۔ میں نے تحریر حدیث کا ذکر کیا تھا لیکن جب میں نے غور کیا تو اس قوم کا خیال آیا جس نے خود ایک کتاب لکھی اور اس پر اس قدر متوجہ ہوئی کہ خدا کی کتاب کو چھوڑ دیا۔ اس بنا پر خدا کی قسم میں کتاب اللہ کو کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہ کروں گا۔ (طبقات ابن سعد)

---

[1] علامہ خضری کی کتاب فقہ اسلامی میں یہ روایت تنویر الحوالک کے حوالہ سے نقل ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ حضرات (رضی اللہ عنہم) احادیث کو دین کا جزو سمجھتے تو جس طرح انہوں نے قرآن کریم کو مرتب کر کے مختلف ممالک میں اس کے نسخے بھجوائے تھے خلافت کی زیرِ نگرانی احادیث کا بھی کوئی ایسا مجموعہ مرتب کر کے کیوں نہ شائع کر دیتے۔ لہٰذا رسول اللہ کے بعد خلافت راشدہ میں بھی جمع و تدوینِ حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔

خلافت راشدہ کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس بات کا کسی کو خیال نہیں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۰۰ھ کے قریب حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ (اموی خلیفہ) نے کچھ احادیث کو اپنے طور پر جمع کرایا۔ اُن کے بعد امام ابن شہاب زہریؒ (المتوفی سنہ ۱۲۴ھ) نے خلفائے بنی امیہ کے حکم سے ایک مختصر سا مجموعۂ احادیث تیار کیا جس کے متعلق ان کا اپنا قول ہے کہ مجھے یہ کام ناگوار گزرا[1]۔ لیکن نہ تو حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کی جمع کردہ احادیث کسی مدون صحیفہ کی شکل میں موجود ہیں اور نہ امام زہری رح کا مذکورہ صدر مجموعہ ہی کہیں موجود ہے۔ البتہ بعد کی کتب احادیث میں ان کی روایات ملتی ہیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوا جب لوگوں کو قرونِ اولیٰ کے احوال و کوائف (تاریخ) لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور یہ خیال بھی پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ مسلمانوں کے لئے دنیا میں عزیز ترین یادا س عہد مبارک کی ہے جس میں نیرِ اسلام کا طلوع ہوا اور اس کی ضیا پاشیوں سے تمام دنیا بقعۂ نور بن گئی۔ اس دور میں کتب و سیرت کی تصنیف کی ابتدا ہوئی۔ ان تصانیف کا مسالہ (Material) وہ روایات (باتیں) تھیں جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور چلی آتی تھیں۔ یہ باتیں اس تمام عہد کو محیط تھیں۔ بعض حضرات نے اس وسیع موضوع کو سمٹایا اور صرف ان ہی باتوں کو اکٹھا کیا جو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ ان باتوں کے مجموعہ کا نام کتب احادیث ہے (احادیث کے معنی ہی باتیں ہیں) احادیث کا پہلا مجموعہ جو اس وقت دستیاب ہو سکتا ہے امام مالک رحمۃ اللہ (المتوفی سنہ ۱۷۹ھ) کی کتاب موطا ہے۔ اس کے مختلف نسخوں میں تین سے چھ سو تک احادیث ملتی ہیں۔ امام مالکؒ کے بعد یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا گیا۔ اور دوسرے ائمہ علوم کو بھی احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس دور میں کئی ایک کتب احادیث مدون ہوئیں۔ عہد عباسی میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کتب احادیث کی نشر و اشاعت نے بھی نمایاں وسعت حاصل کر لی۔ کتب احادیث میں سب سے زیادہ مشہور صحیحین (صحیح بخاری و صحیح مسلم) ہیں۔ امام بخاری رح (المتوفی سنہ ۲۵۶ھ) نے قریب چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں اور ان میں سے کاٹ چھانٹ کر جو مجموعہ تیار کیا اس میں مکررات حذف کر دینے کے بعد دو ہزار چھ سو تیس احادیث ہیں۔ اسی کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ (یعنی قرآن کے بعد دنیا میں صحیح ترین کتاب) کہا جاتا ہے۔ کتب احادیث کے اسی قسم کے مجموعے ہیں جنہیں دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔ تدوین کتب احادیث کی اس مختصر سی تاریخ سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ احادیث کو

[1] مختصر جامع بیان العلم

صحیح حیثیت کیا ہے۔ اگر یہ چیزیں بھی دین کا جزو ہوتیں تو ظاہر ہے کہ خود نبی اکرمؐ احادیث کا مستند مجموعہ لکھوا کر چھوڑ جاتے۔ آپ کے بعد آپ کے جانشین (خلفائے راشدینؓ) اس مجموعہ کے مصدقہ نسخے مختلف مقامات میں بھیجتے۔ یہی مجموعہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ دین کا جزو بنا رہتا۔ لیکن ایسا تو کسی نے نہیں کیا۔ بلکہ جس طرح انفرادی طور پر بعض لوگوں نے کتب تاریخ تصنیف کیں، اسی طرح کتب احادیث کو مدون کیا۔ اب خیال فرمایئے کہ دین بھی ایسی چیز ہے جیسے خود اللہ تعالیٰ اور نبی اکرمؐ یوں لوگوں کی انفرادی کوششوں کے حوالے کر دیتے۔ یہ تو اتفاق ہے کہ امام بخاری یا ایسے دیگر حضرات نے ان باتوں کو یک جا جمع کر دیا جو اس زمانہ میں عام طور پر مشہور تھیں۔ ورنہ جس طرح ان سے پہلے اس قسم کی کوئی کتابیں موجود نہ تھیں، اگر یہ حضرات بھی اس کی کوشش نہ کرتے تو دین کا آدھا حصہ تو (معاذ اللہ) بالکل کھویا ہوا تھا۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ وہ خدا جو دین کے مکمل ہونے کی سند قرآن کریم میں بالتصریح فرما دے اور وہ رسول گرامیؐ کہ جن کے بعد قیامت تک کسی اور رسولؐ نے نہ آنا ہو وہ دین کے ایک ایسے اہم حصہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے۔

پھر ایک دوسری صورت بھی تھی۔ جس طرح قرآن کریم محفوظ کیا گیا تھا اگر لوگ نبی اکرمؐ کی احادیث کے الفاظ کو یاد کر لیتے اور وہی الفاظ سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہتے تا آنکہ وہ کتابی شکل میں لکھ لئے جاتے تو بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ کتب احادیث کا مجموعہ ایک یقینی چیز ہے۔ لیکن یہ بات بھی نہیں ہوئی۔ احادیث کی جس قدر کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں (بخاری اور مسلم سمیت) ان میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ اس کے الفاظ وہی ہیں جو رسول اللہؐ نے فرمائے تھے۔ اس بات پر پھر غور کیجئے کہ کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جس کے الفاظ رسول اللہؐ کے الفاظ ہوں۔ تمام احادیث، روایات بالمعنے ہیں۔ یعنی ان کا انداز یہ ہے کہ مثلاً ایک صحابیؓ نے رسول اللہؐ سے کچھ سنا، اس نے جو کچھ سمجھا، اپنے الفاظ میں کسی دوسرے سے بیان کیا، اس نے جو کچھ اخذ کیا اسے آگے منتقل کیا۔ اب ذرا تصور میں لایئے اس صورت حالات کو۔ یہ سلسلہ ایک دو دن نہیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال نہیں بلکہ دو اڑھائی سو سال تک یونہی جاری رہے اور اس کے بعد لوگوں میں اس قسم کی پھیلی ہوئی باتوں کو یک جا جمع کیا جائے تو ان باتوں کو پہلے کہنے والے (یعنی نبی اکرمؐ) کے بیان فرمودہ مفہوم سے جس قدر تعلق ہوگا وہ ظاہر ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ آپ ایک کمرہ میں دس آدمیوں کو بٹھا کر ایک کے کان میں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کیجئے، اس کے بعد یہ بات کانوں کان منتقل ہوتی ہوئی جب پھر آپ تک پہنچے تو آپ دیکھیں گے کہ جو کچھ آپ نے کہا تھا اس میں اور جو کچھ آپ دسویں آدمی سے سن رہے ہیں اس میں کس قدر فرق ہوتا ہے۔ اور جب یہ سلسلہ اڑھائی سو سال تک جاری رہے اور کروڑوں نہیں تو کم از کم لاکھوں آدمیوں کے ذریعے سے یہ باتیں آگے منتقل ہوئی ہوں تو ان میں جو اصلیت باقی رہے گی وہ ظاہر ہے۔ جو بات

کانوں کے راستے قلب تک پہنچے اور پھر قلب سے زبان کی راہ باہر آئے اس پر قلب انسانی کی رنگینی کا کچھ نہ کچھ اثر ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ آمیزش ارادۃً ہی ہو۔ غیر ارادی طور پر غیر محسوس انداز سے اس کا اثر اس میں ضرور آجائے گا۔ ارباب جرح و تعدیل نے یہ ضرور کیا کہ ایک حدیث میں جس قدر راویوں کا سلسلہ آتا ہے ان کے متعلق بڑی کد و کاوش سے یہ تحقیق کی کہ وہ ثقہ تھے پرہیزگار تھے متقی تھے لیکن یہ امر بالکل مدبہیات سے ہے کہ ایک شخص کا متقی و پرہیزگار ہونا اس بات کے لئے مستلزم نہیں کہ اس کی یادداشت بھی اچھی ہو، اور اگر یادداشت بھی درست ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس میں حقائق و معارف کے سمجھنے کی کماحقہٗ استعداد ہو اور پھر انہیں بعینہٖ اسی طرح۔ لیکن اپنے الفاظ میں آگے منتقل کرنے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم پائی جائے۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے کوئی عقیدہ جھٹلا نہیں سکتا۔ آپ اپنے گردوپیش نظر دوڑایئے اور ان لوگوں کو دیکھئے، اور دیکھئے کہ جنہوں نے عمر بھر جھوٹ نہ بولا ہو، صوم وصلوٰۃ کے شدت سے پابند ہوں، متقی اور پرہیزگار بھی ہوں، اور اس کے بعد پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ ان میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن میں منتقل کرنے کی استعداد بھی ہے۔ خود یہ حقیقت کہ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کو اس کے اپنے الفاظ میں محفوظ رکھنے کا اس قدر محکم انتظام فرمایا اس امر کی دلیل ہے کہ دین کے معاملہ میں صرف مفہوم کا آگے منتقل ہوتے جانا قابل اطمینان نہیں ہے۔ اس قسم کی چیز کبھی یقینی نہیں کہلا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ایک آیت قرآنی کو پڑھتے ہیں تو پورے جزم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ قال اللہ تعالیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا)۔ لیکن جب کوئی حدیث بیان کی جاتی ہے تو اس کے بعد یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں کہ "او کما قال رسول اللہ" (یعنی یوں، یا جیسے رسول اللہؐ نے فرمایا ہو)۔ یہ چیز بعد کی وضع کردہ نہیں۔ بلکہ خود صحابہؓ کا بھی یہی انداز تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تذکرہ میں مذکور ہے کہ وہ جب قال رسول اللہ کہتے تھے تو کانپ اٹھتے تھے اور کہتے تھے: اس طرح یا اس کے مثل، یا اس کے قریب، یا، یا (مسند دارمی) حضرت عمرؓ اسی خوف سے حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے کہ کہیں مجھ سے حدیث کی روایت کرنے میں کمی بیشی نہ ہو جائے۔ (انساب الاشراف از بلاذری) یہ چیزیں اس پر شاہد ہیں کہ آج حدیث کو دین ماننے والوں کو بھی اس امر کا یقین نہیں ہوتا کہ رسول اللہ نے یہی فرمایا تھا یا کچھ اور اسی لئے ان کے ہاں بھی احادیث کو اقوال رسول اللہؐ (حضورؐ کی باتیں) نہیں کہا جاتا۔ بلکہ اقوال منسوب الی الرسول کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو جمع حدیث کے وقت رسول اللہ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ کہئے کہ ایسی چیز کبھی یقینی کہلا سکتی ہے؟ اور جب یہ اس قدر ظنی ہے تو پھر دین کیسے بن سکتی ہے؟

یہاں تک تو ہم نے اس مغرضہ کے ماتحت لکھا ہے کہ جو کچھ راویوں نے بیان کیا اس میں انہوں نے دانستہ کسی قسم کی تحریف نہیں کی۔ جس چیز کو دیانتداری سے سمجھا کہ رسول اللہؐ کی طرف سے آئی ہے اسے اپنی سمجھ کے مطابق دیانتداری سے آگے منتقل کر دیا۔ لیکن اس کے بعد اس حقیقت کو بھی سامنے

رکھئے کہ اس اڑھائی سو سال کے عرصہ میں ہزاروں ایسے منافق پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کے لباس میں اپنی ظاہرداری کے تقویٰ اور ثقاہت کا سکہ جما کر لاکھوں حدیثیں وضع کیں اور انہیں ذات رسالتمآب کی طرف منسوب کر کے آگے منتقل کر دیا۔ ان میں بعض کی منافقت کا پردہ چاک ہو گیا اور انہوں نے اپنی ان خبیثانہ حرکات کا اعترافات بھی کیا۔ لیکن کتنے ایسے ہوں گے جن کا راز افشا نہ ہو سکا۔ پھر اتنا ہی نہیں۔ ہزاروں ایسے مسلمان تھے جو نہایت نیک نیتی سے اس لئے حدیثیں وضع کرتے تھے کہ لوگوں میں دین کا شوق پیدا ہو۔ مثلاً کسی بات کو انہوں نے اچھا سمجھا اور بجائے اس کے کہ اسے اپنی طرف سے کہیں اسے جناب رسول اکرمؐ کی طرف منسوب کر کے پیش کر دیا کہ اس کی قیمت بڑھ جائے اور اثر زیادہ ہو۔ اس قسم کی وضع شدہ احادیث کا ٹھکانا ہی نہیں (تفصیل کے لئے موضوعات ملا علی قاری دیکھئے)۔ ارباب جرح و تعدیل نے معیار ثقاہت و تقویٰ اور پرہیزگاری قرار دیا تھا۔ اس قسم کے واضعین حدیث کے تقویٰ و پرہیزگاری میں کسے شبہ تھا۔ لہٰذا ان کی ثقاہت مسلم تھی۔ یہ چیزیں بھی اس طرح آپ کا دین بن گئیں۔ آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم سے پیشتر کی تمام کتب سماوی کو جو قرآن نے ظنی اور قیاسی قرار دے کر ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے تو اس کی یہی وجوہات ہیں۔ اوّل تو وہ ان الفاظ میں محفوظ نہیں رہ سکی تھیں جن میں وہ خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ اصل صحائف کے ضائع ہو جانے کے بعد ان کے جامعین نے ان صحائف کو اِدھر اُدھر کی روایات کی بنا پر اکٹھا کیا تھا۔ پھر ان میں وہ روایات بھی شامل ہو گئی تھیں جو لوگوں نے اس دوران میں وضع کی تھیں۔ نیز وہ کچھ بھی جو خود ان کے ارباب مذاہب احبار و رہبان نے اپنے ہاتھوں سے لکھ کر ان میں شامل کر دیا تھا۔ اب اگر کتب سابقہ کا کوئی نسخہ جو اس طرح مدون ہوا تھا قرآن کے نزدیک قابل اعتبار نہیں قرار پا سکتا تو فرمائیے کہ احادیث کے مجموعے، جو بالکل اسی طرح سے مرتب ہوئے ہیں، کس طرح یقینی قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ احادیث کے متعلق ارباب جرح و تعدیل نے بڑی جانچ پڑتال کی۔ لیکن یہ تمام کوششیں انسانی تھیں۔ ان حضرات کی کوششیں لائق ہزار تحسین سہی، لیکن ان کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ انہوں نے اپنے سے پیشتر سینکڑوں برسوں کے انسانوں کے متعلق تحقیق و تفتیش کے بعد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا تھا ان حضرات کو خدائی صفات کا حامل سمجھ لینا ہے۔ کتب احادیث کے متعلق زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تاریخ کی دوسری کتابوں سے زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ لیکن بالآخر یہ ہیں تو انسانی کارنامے۔ خدا کی حفاظت کی ذمہ داری تو ان کے ساتھ نہیں۔ اب جامعین حدیث کو اور علماء جرح و تعدیل کو تنقید کی حد سے بالاتر سمجھ لینا اور ان کی ہر بات کو جوں کا توں تسلیم کر لینا ان کو بشریت کی سطح سے اوپر لے جانا ہے۔ اور حضرات رواۃ

کے متعلق، خواہ وہ کتنے ہی ثقہ اور عدول کیوں نہ قرار دیئے گئے ہوں، یہ عقیدہ رکھنا کہ اُن سے غلط بیانی یا مفہوم کو غلط سمجھنے یا غلط ادا کرنے کا امکان ہی نہ تھا اُن کو معصوم اور منزہ عن الخطا قرار دینا ہے۔ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں۔ یعنی جو لوگ اُن کے سامنے موجود تھے اُن سے سنیں اور اس کے بعد اپنی بصیرت کے مطابق ان میں سے پانچ لاکھ ستانوے ہزار کو ناقابلِ اعتبار سمجھ کر مسترد قرار دیدیا اور تقریبا تین ہزار کے قریب اپنی کتاب میں درج کرلیں۔ لیکن غور فرمائیے کہ امام بخاری کے پاس کون سی سند تھی جس کے مطابق انہوں نے جن تین ہزار احادیث کو اپنے مجموعہ میں داخل کیا ہے ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہی۔ وہ کتنے ہی بڑے عالم سہی تھے تو بالآخر انسان۔ اور ایک انسان کے متعلق سمجھ لینا کہ اس کی تحقیق کا نتیجہ ایسا ہے کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور وہ تنقید کی حد سے بالا ہے، سوائے شخصیت پرستی کے اور کیا ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق یہ فیصلہ کرے کہ وہ ثقہ تھا یا نہیں تو یہ فیصلہ کتنا ہی بے لاگ کیوں نہ ہو اس میں عام طور پر رجحانات قلبی کا شائبہ آجائے گا۔ اور قلبی رجحانات میں عقیدے کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ امام بخاری کو امام ابو حنیفہ کے ساتھ اس مسئلہ میں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں، اختلاف تھا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ امام اعظم کو ثقہ نہیں قرار دیتے۔ پھر یہیں تک بس نہیں، چونکہ امام اعظم کوفہ کے رہنے والے تھے، اس لئے تمام کوفہ والے غیر معتبر، ناقابلِ روایت حدیث قرار پا گئے۔ اور کوفہ چونکہ عراق میں ہے اس لئے عراق والے بھی اسی زمرہ میں شمار ہو گئے۔ اور فیصلہ کردیا کہ عراق والوں کی سو حدیثوں میں ننانوے مجروح ہیں۔ جو ایک ہو تو اسے بھی مشتبہ ہی سمجھو۔ اسی طرح ایک فروعی عقیدہ کے اختلاف کی بنا پر دو جلیل القدر امام یعنی امام ابو ذرعہ اور امام ابو حاتم نے خود امام بخاری کی ثقاہت پر اعتراض کیا ہے اور ان سے روایت ترک کردی ہے۔ بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ ان کی آپس میں یہ کیفیت ہے کہ امام مسلم رح امام بخاری رح کو مختل الحدیث قرار دیتے ہیں۔ ان ائمہ علوم کی اس قسم کی باہمی چشمک کی بے شمار مثالیں کتب روایات میں ملتی ہیں۔ عقائد کے اختلاف سے احادیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کے اختلاف کا سب سے بڑا مظاہرہ ہمارے سنی اور شیعہ جماعتوں کا وجود ہے۔ سنی حضرات کے مجموعے اپنے ہیں اور ان کا سلسلہ روایت تابعین رح و صحابہ رض تک پہنچتا ہے۔ جو تعلیم ان مجموعوں میں جناب نبی اکرم کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس سے بہت ہی مختلف تعلیم احادیث کے ان مجموعوں میں ہے جو شیعہ حضرات کے پاس ہیں۔ ان کا سلسلہ روایت بھی اسی طرح تابعین رح و صحابہ رض تک پہنچتا ہے۔ اب یہ حضرات (کم از کم سنی حضرات) تو یہ تصور میں بھی نہیں لاسکتے کہ وہ بزرگان دین جو ان احادیث کے راوی ہیں جو شیعہ حضرات کے مجموعوں میں داخل ہیں وہ (نعوذ باللہ) سب جھوٹ بناکر

غیر معتبر تھے۔ ان کو بھی لامحالہ ثقہ اور معتبر ماننا پڑے گا۔ اب صورت معاملہ یوں ہوئی کہ ثقہ رواۃ کی جماعت سے وہ احادیث امت کو ملیں جو سنّی حضرات کے ہاں صحیح ہیں۔ اور ثقہ رواۃ ہی کی ایک دوسری جماعت سے وہ احادیث ملیں جو شیعہ کے ہاں صحیح ہیں۔ اور دونوں آپس میں ٹھہریں متناقض۔ اب کہیئے کہ کون سی تعلیم رسول اللہ کی قرار دی جائے اور اسے جزو دین سمجھا جائے اور کون سی غلط! اور اگر کسی راوی کے ثقہ ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ ارباب جرح و تعدیل یا جامعین احادیث کا ہم مسلک بھی ہو تو یہ تو صاف پارٹی بازی ہے، انصاف نہیں ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جو جماعت آپ کی ہم مسلک نہ ہو اس میں سب کے سب جھوٹے اور غیر معتبر ہوں۔ پھر ایک چیز اور بھی دلچسپ ہے۔ خود امام بخاری (اور دوسرے جامعین احادیث) جن بزرگوں کو ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں (اور ان کی روایات مردود ٹھہراتے ہیں خود ان ہی کی روایات سے اپنے مجموعوں میں احادیث درج کر دیتے ہیں۔ دیکھئے میزان الاعتدال از علامہ ذہبی و تدریب الراوی وغیرہ۔

یہ تو ہیں خارجی شہادات جن سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ احادیث نہ خود نبی اکرمؐ کے نزدیک جزو دین تھیں نہ صحابہ کبارؓ نے انہیں ایسا سمجھا۔ اور احادیث کے جو مجموعے ہمارے پاس آئے ان میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں جس کے متعلق دعویٰ کیا جا سکے کہ وہ رسول اکرمؐ کے الفاظ ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر داخلی شہادات خود ان مجموعوں کے مشمولات (Contents) ہیں۔ ان کیا کس کس قسم کی باتیں لکھی ہیں ان کے ذکر سے میری روح کانپتی ہے۔ ہاتھ میں قلم لرزتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ بیان آپ کو بے حد تعجب انگیز اور حیرتناک معلوم ہوگا اور معلوم ہونا بھی چاہیئے اس لئے کہ ہمارے دلوں میں ان مجموعوں کی عزت و عظمت قریب قریب قرآن کریم کے درجہ تک کی ہے۔ لہٰذا ان کے متعلق ایسی بات یقیناً تحیّر انگیز ہوگی۔ لیکن میں آپ سے صرف اتنا عرض کروں گا کہ آپ نہ میری سنیئے اور نہ کسی اور کی، بلکہ صحیح بخاری لے کر خود مطالعہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ میں نے کیا لکھا ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ آپ سے کہا جائے گا کہ ذرا سوچئے تو سہی امام بخاری علیہ الرحمۃ اتنے پایہ کے امام، پھر ان کے بعد ایک ہزار سال کے عرصے میں کتنے بڑے جلیل القدر علماء عظام و بزرگان کرام ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اس کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا ہے، کہیئے ایسی کتاب میں (نعوذ باللہ) اس قسم کی بات ہو سکتی ہے۔ اس کے جواب میں، میں پھر یہی عرض کروں گا کہ ان بزرگانِ سلف (علیہم الرحمۃ) کی عزت و توقیر بجا اور درست۔ لیکن جب ہمارے پاس بخاری شریف موجود ہے تو ہم اسے خود کیوں نہ ایک نظر دیکھ لیں۔ آج کل تو بخاری شریف کا اردو ترجمہ بھی مل سکتا ہے۔ آپ عربی نہیں جانتے تو اردو ترجمہ ہی دیکھ لیں اور اس کے بعد علیٰ وجہ البصیرت فیصلہ فرمائیں کہ میں نے درست لکھا ہے یا نہیں۔ آپ کو اس میں ایسی باتیں ملیں گی جنہیں آپ کبھی جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں

کریں گے۔ اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف جو انسانیت کے معراجِ کبریٰ کا مظہرِ اتم تھی۔ وہ ہستیٔ گرامی مرتبت (فداہ ابی و امی) جو علم و ایقان کے افقِ اعلیٰ پر جلوہ افروز تھی۔ آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے کہ اس نورِ مجسم رحمۃ اللعالمینؐ کی ذاتِ عظمت مآب کی طرف کس کس قسم کی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔

پھر کہا یہ جاتا ہے کہ یہ مجموعے ظنی ہی سہی لیکن دنیا میں کتنی ظنی باتیں ہیں جنہیں ہم صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اور ہمارا روزمرہ کا کاروبار ہی اس بات پر چلتا ہے۔ دیکھئے آپ تاریخ کے واقعات کو مانتے ہیں حالانکہ وہ بھی ظنی ہوتے ہیں۔ آپ اخبارات میں خبریں پڑھتے ہیں حالانکہ وہ بھی یقینی نہیں ہوتیں۔ پھر احادیث سے کیا چڑ ہے کہ آپ انہیں یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ ظنی ہیں۔

دلیل بظاہر معقول نظر آتی ہے۔ لیکن یہ دیکھنے کے بعد کہ ان دونوں باتوں میں فرق کتنا بڑا ہے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ تاریخ یا اخبارات ہمارے لئے دین کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میرا جی چاہے ایک واقعہ کو صحیح تسلیم کروں اور اگر اس کے خلاف میرے پاس دلائل ہوں تو یہ کہہ کر رد کر دوں کہ مجھے اس کی صحت پر شبہ ہے۔ برعکس اس کے احادیث ہمارے لئے دین قرار دی جاتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تنقید کی حد سے بالاتر ہیں۔ اگر مجھے اُن کے متعلق ذرا سا بھی تردد پیدا ہو جائے تو ایمان کی خیر نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے۔ مثلاً تاریخ میں لکھا ہو کہ فلاں بادشاہ نے فلاں مقام پر جھوٹ سے کام لیا۔ تو میں چاہوں تو اسے صحیح تسلیم کروں نہ چاہوں تو اسے مسترد کر دوں۔ نہ مجھ پر اس باب میں کوئی پابندی عائد ہوتی ہے نہ میرے ایمان پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ لیکن جب بخاری شریف کی یہ حدیث میرے سامنے آئے کہ "حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا" تو چونکہ حدیث کو جزوِ دین قرار دیا گیا ہے اس لئے اس کا تسلیم کرنا مجھ پر لازم ہو گیا۔ اگر صحیح تسلیم نہیں کرتا تو حدیث کے متعلق شک کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوتا ہوں۔ اور اگر اس کی صحت پر ایمان لاتا ہوں تو خدا کے ایک برگزیدہ نبیؑ کو (معاذ اللہ) جھوٹا سمجھنے پر مجبور ہوتا ہوں۔ یا مثلاً اخبار میں آپ دیکھتے ہیں کہ فلاں شہر میں کسی شخص نے ایک دوسرے شخص کی ناک کاٹ ڈالی، تو اسے ماننا نہ ماننا آپ کے ایمان کا جزو نہیں۔ لیکن جب آپ بخاری شریف کی اس حدیث کو پڑھیں گے کہ "جب ملک الموت حضرت موسیٰؑ کی روح قبض کرنے کے لئے آئے تو حضرت موسیٰؑ نے ان کے ایک ایسا تھپڑ مارا کہ ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی" تو آپ کو اس واقعہ کو صحیح ماننا پڑے گا کہ اس میں شک کرنے سے آپ دین میں شک کر رہے ہیں۔ اس سے آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ دنیا کی دوسری ظنی چیزوں کے تسلیم کرنے میں اور ایک ایسی ظنی چیز کے تسلیم کرنے میں جسے آپ کے دین کا جزو قرار دیا گیا ہو، کتنا بڑا فرق ہے۔ ہم خود بھی کہتے ہیں کہ چونکہ احادیث یقینی نہیں ظنی ہیں اس لئے یہ دین نہیں قرار پا سکتیں۔ ان کی حیثیت تاریخ کی ہے اور تاریخ تنقید کی حد سے بالاتر نہیں ہوتی۔

اس مقام پر یہ سوال اُبھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ جب قرآن کریم میں "خدا اور رسول" کی اطاعت کا حکم ایسی تاکید سے آیا ہے تو اگر، احادیث ظنی ہیں تو پھر رسول کی اطاعت کس طرح سے کی جائے؟ اس سوال کے جواب کے لئے ایک مرتبہ پھر "خدا اور رسول" کے اس قرآنی مفہوم کو سامنے لانا ہوگا جو میرے متعدد مضامین میں آپ کی نگاہوں سے گزر چکا ہے۔ یعنی "خدا اور رسول" سے مراد وہ مرکز ملت ہے جو دنیا میں خدائی قوانین نافذ کرے۔ رسول اللہ، جہاں ایک رسول تھے (یعنی خدا کی دعوت کو انسانوں تک پہنچانے والے) وہیں آپ اس حکومت خداوندی کے اولیں مرکز بھی تھے۔ لہٰذا آپ کی اطاعت، جو بہ حیثیت امیر ملت اور مرکز اُمت کی جاتی تھی "خدا اور رسول" کی اطاعت تھی۔ حضورؐ کے بعد مرکز ملت خلیفۃ الرسول قرار پاگئے۔ اُس وقت "خدا اور رسول" خلیفۃ المسلمین کی اطاعت تھی۔ یعنی حضرت ابوبکر صدیق کے فیصلوں کی اطاعت جو آپ بہ حیثیت امیر المؤمنین صادر فرماتے تھے۔ یہی اطاعت "خدا اور رسول" تھی۔ یہی سلسلہ آگے منتقل ہوتا رہا۔ تا آنکہ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور پھر اس سے یہ شیرازہ ہی منتشر ہوگیا۔ اس وقت "خدا اور رسول" کی اطاعت کا صحیح مفہوم بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اب خدا کی اطاعت کا مفہوم لیا گیا قرآن کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کا مفہوم احادیث کی اتباع۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مفہوم مسلمانوں کے دور تشتت و انتشار کی پیداوار ہے۔ نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ میں "خدا اور رسول" کی اطاعت سے مفہوم مرکز ملت کے فیصلوں کی اطاعت تھا اور بس! قرآن کریم نے جن احکامات کی تفاصیل خود بیان کر دی تھیں ان میں نہ رسولؐ کو رد و بدل کا حق حاصل تھا نہ حضورؐ کے جانشینوں کو۔ لیکن جن معاملات کے متعلق قرآن کریم نے محض اصولی احکام دیئے ہیں ان کی جزئیات مرتب کرنے کا کام مرکز ملت کے ذمہ تھا۔ ان جزئیات کا قرآن کریم میں بیان نہ ہونا اور جو جزئیات رسول اللہ نے مرتب فرمائی تھیں ان کا قرآن کی طرح محفوظ نہ رکھنا اس امر کی بدیہی دلیل ہے کہ ان جزئیات کو غیر متبدل اور اٹل قرار دینا نہ منشائے خداوندی تھا نہ منشائے رسالت۔ خدا اور اس کے رسول کے نزدیک ان میں مختلف زمانوں میں، بہ اقتضائے حالات، رد و بدل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ رد و بدل انفرادی طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ مرکز ملت ہی ایسا کر سکتا ہے۔ آج ہم میں مرکز ملت علیٰ منہاج نبوت موجود نہیں اس لئے ہماری زندگی بھی اسلامی نہیں اور اسی لئے طرح طرح کے اعتراضات اور شبہات ہمارے قلب و دماغ کے لئے وجہ پریشانی اور باعث تردد بن رہے ہیں۔ مرکز ملت قائم ہو جائے تو ان تمام امور کا تصفیہ خود بخود ہو جائے۔ ہر مرکز قرآن اپنے سامنے رکھے گا۔ پھر اُن امور کے لئے جن کی جزئیات قرآن نے بیان نہیں کیں، اپنے پیش رو مراکز ملت (PREDECESSORS) کے فیصلوں کا مطالعہ کرے گا اور اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق ان پر غور و خوض کرنے کے بعد اگر وہ انہیں علی حالہٖ رکھنا

چاہے گا تو اسی طرح رہنے دے گا اور اگر کہیں ردوبدل کی ضرورت سمجھے گا تو ایسا بھی کر دے گا۔ ملت کے لئے خدا اور رسول کی اطاعت مرکز کے ان فیصلوں کی اطاعت کا نام ہوگا۔ چونکہ مسلمانوں کی نگاہوں سے یہ قرآنی نظامِ زندگی اوجھل ہو چکا ہے اس لئے مرکز کی صحیح پوزیشن بھی ان کے سامنے نہیں رہی۔ اور اسی لئے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کا صحیح مفہوم بھی بآسانی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آجائے تو پھر احادیث کا صحیح مقام بھی سامنے آجاتا ہے۔ اس وقت یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ اور صحابہ کبار نے کیوں احادیث کے مجموعے مرتب کر کے اُمت کو نہیں دیئے تھے۔ وہ اُمت کو صرف دین دینا چاہتے تھے اور دین، خدا کی کتاب کے اندر ہے یا ان جزئیات کے اندر جو کتاب اللہ کے اصولوں کے تحت، ہر زمانہ میں، قرآنی احکام نافذ کرنے والی حکومت وضع اور نافذ کرے۔ لہٰذا اگر یہ بھی تحقیق ثابت بھی کر دیا جائے کہ فلاں روایت یقینی طور پر سچی ہے تو بھی اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ حضورؐ کے زمانۂ مبارک میں دین کے فلاں گوشہ پر کس طرح عمل کیا گیا تھا۔ اگر ہمارے زمانہ کا مرکزِ حکومتِ قرآن سمجھے کہ اس عمل میں کسی ردوبدل کی ضرورت نہیں تو اسے علیٰ حالہ رائج کر دے اور اگر سمجھے کہ ہمارے زمانہ کے اقتضات اس میں ردوبدل چاہتے ہیں تو اس میں ردوبدل کر لے۔ یہ ہے احادیث کی صحیح دینی حیثیت۔

نتیجہ۔ تصریحاتِ بالا سے یہ امور واضح ہو گئے ہوں گے کہ

(۱) دین یقینی ہونا چاہیئے۔ ظنی شے دین نہیں بن سکتی۔

(۲) یقینی چیز قرآن کریم ہے جس کی حفاظت کا خود اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا اور نبی اکرمؐ نے اس کے الفاظ محفوظ کر کے اسے امت کے پاس چھوڑا، اور پورا پورا اطمینان کر لیا کہ اس کے الفاظ مختلف نوشتوں میں اور حفاظ کے سینے میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے اسی قرآن کی حفاظت اور نشر و اشاعت کو اپنا اہم دینی فریضہ قرار دیا۔

(۳) قرآن کریم کے علاوہ نبی اکرمؐ نے کسی چیز کو لکھوایا، نہ یاد کرایا، نہ سنا، نہ اس کی صحت کی کوئی سند عطا فرمائی۔ اور حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے بھی نہ احادیث کا کوئی مجموعہ تیار کرایا نہ کوئی جماعت پیدا کی جو انہیں یاد کرے۔ برعکس اس کے ایسی شہادتیں پائی جاتی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ اور ان کے جانشینوں نے اس کی مخالفت کی۔

(۴) جب لوگوں کو صدرِ اولیٰ کی تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو بعض حضرات کو اس امر کا بھی خیال پیدا ہوا کہ خاص وہ اقوال و احوال جو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، انہیں الگ کتابوں میں جمع کر دیا جائے ان ہی کا نام کتبِ احادیث ہے۔

(۵) احادیث کی وہ کتابیں جنہیں مستند ترین سمجھا جاتا ہے (یعنی صحیحین) حضورؐ کے قریب دو ڈھائی سو

بہت عرصے کے بعد مدون ہوئیں۔ (صحاح ستہ میں سے اولین کتاب بھی ڈیڑھ سو برس بعد مدون ہوئی)۔ ان کا ذریعہ تدوین وہ روایات تھیں جو اس وقت لوگوں میں عام طور پر مشہور تھیں۔

(۲) یہ روایات قرآن کریم کی طرح لوگوں میں لفظاً منتقل ہو کر نہیں آئی تھیں، بلکہ ان کا مفہوم منتقل ہو کر آتا رہا۔

(۳) کتب احادیث میں کوئی حدیث بھی ایسی نہیں جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ اس کے الفاظ خود رسول اللہ کے الفاظ ہیں۔

(۴) حضرات جامعین احادیث کے بعد ارباب جرح و تعدیل نے یہ فیصلے کئے کہ فلاں فلاں راوی معتبر ہے اور فلاں فلاں غیر معتبر۔ یعنی انسانوں نے اپنے سینکڑوں برس پہلے کے انسانوں کی ثقاہت کے متعلق فیصلے کئے اور انہی فیصلوں کے مطابق احادیث صحیح و ضعیف قرار پائیں۔

(۵) ان مجموعوں میں ایسی باتیں موجود ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں۔ جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اور انبیاء کرام کی شان میں طعن پایا جاتا ہے، جن سے بصیرت ابا اور عقل سلیم لرزہ کرتی ہے اور جن میں ایسی ایسی چیزیں ملتی ہیں جنہیں آپ نبی اکرم کی طرف منسوب کرنے کی کبھی جرأت نہ کر سکیں گے۔ اس کے لئے آپ زیادہ نہیں تو صرف ایک صحیح بخاری کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ یہ درست ہے یا نہیں۔

(۶) یہ ہیں وہ مجموعے جنہیں قرآن کریم کے ساتھ دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے، بلکہ یہاں تک کہہ دیا جاتا ہے کہ "احادیث قرآن کریم کی اتنی محتاج نہیں جتنا قرآن احادیث کا محتاج ہے"۔ (امام اوزاعی)، اور یہ کہ "احادیث قرآن پر قاضی ہیں"۔ (امام یحییٰ) یعنی قرآن اور احادیث میں اگر تعارض ہو تو جو فیصلہ احادیث دیں وہ قابل قبول ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حدیث کے صحیح ہونے کا یہ اصول بھی قرار دیا گیا ہے کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو لیکن احادیث کو دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ اصول تبرکاً داخل رہا۔ عملی طور پر اس سے زیادہ کام نہیں لیا گیا۔ عملاً یہی اصول کارفرما رہا کہ احادیث کے راوی کیسے ہیں۔ یعنی اگر ایک حدیث کا سلسلہ اسناد (راویوں کا سلسلہ) معتبر قرار دیدیا گیا ہو تو وہ حدیث صحیح قرار پا جائے گی۔

ان تصریحات کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ:

(۱) یقینی چیز قرآن مجید ہے اور دین اسی کے اندر ہے۔

(۲) احادیث کی حیثیت تاریخ کی ہے۔ لہٰذا یہ مجموعے تنقید کی حد سے بالاتر نہیں جس طرح امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے قریب تین ہزار کا انتخاب فرما کر بقایا مسترد کر دی

تھیں۔ اسی طرح ان کے مجموعے سے بھی ایسی احادیث الگ کی جاسکتی ہیں جو دین کے معیار پر صحیح نہیں اترتیں، اس لئے کہ یہ تسلیم کر لینا کہ راویوں نے کسی ایک بات کو صحیح نہیں سمجھا، اس بات سے کہیں بہتر ہے کہ ایک ایسی چیز کو ذاتِ رسالتمآب کی طرف منسوب کر دیا جائے جو اُن کے شایانِ شان نہ ہو۔ اس قسم کی تنقید و تنقیح کے بعد احادیث کے ان مجموعوں سے ہم دین کے سمجھنے میں اور جزئیات کی تشکیل میں استفادہ کر سکتے ہیں۔ دین، یہ پھر بھی قرار نہیں دیجا سکتیں۔

رہا یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ پھر اس حقیقت پر بھی ہمارا ایمان ہے کہ نبی اکرمؐ قرآن ہی کا اتباع کرتے تھے اس لئے حضورؐ کا کوئی قول یا عمل، قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ ان دو اصولوں کے بعد احادیث کو پرکھنے کا نہایت عمدہ معیار ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جو حدیثیں قرآن کریم کے مطابق ہوں اُن کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ رسول اللہ کی حدیث ہو سکتی ہے۔ لیکن جو حدیث قرآن کے مطابق نہ ہو اسے کبھی رسول اللہ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کے راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ قرار دیئے جائیں۔ جو احادیث اس طرح پرکھی جائیں اُن کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے ہاں کی قابلِ اعتماد تاریخِ دین ہے۔

(۳)

اس وقت تک ہم نے شخصیت پرستی کے جس قدر مظاہر پیش کئے ہیں ان میں ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ انہیں اپنی اطاعت کے لئے کسی نہ کسی سند کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اب ہم شخصیت پرستی کے ایک ایسے گوشے کی طرف آتے ہیں جہاں مطاع اور مطیع کے لئے کسی قسم کی سند کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ گوشہ پیر پرستی کا اندھی اطاعت اور انسانی غلامی کا شدید ترین مظہر ہے۔ اس میں پیر کا ہر حکم، خدا کے حکم کی طرح واجب التسلیم ہوتا ہے۔ نہیں! بلکہ خدا کے حکم سے بھی زیادہ۔ کیونکہ اگر پیر کا حکم خدا کے حکم کے خلاف ہوتا تو اطاعت پیر کے حکم کی ہوتی، خدا کی نہیں۔ اس لئے کہ پیر پرستی کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ "ہرر وٹھے گر میل دے گر روٹھے میلے کون" (اگر خدا ناراض ہو جائے تو اُسے بذریعہ مرشد منایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر مرشد روٹھ جائے تو اسے کون منا سکتا ہے) لہٰذا اگر کبھی خدا اور مرشد میں سے ایک کو رکھنے اور دوسرے کو چھوڑنے کی مجبوری لاحق ہو جائے تو مسلکِ راہِ طریقت یہ ہے کہ "ہر تیاگوں گرو نا ہیں تیاگوں" (خدا کو چھوڑ دینا چاہیئے، مرشد کو نہیں چھوڑنا چاہیئے) مرشد کے پاس اپنے احکام کی اطاعت کے لئے سند حضرت علم لدنی "کی ہوتی ہے۔

جو علم و شہادت کی تمام شرائط سے بے نیاز ہے۔ مرشد اپنا علم براہ راست "خدا اور رسول" سے حاصل کرتا ہے۔ اور یہ وہ علم ہے جو نہ خدا کی کتاب میں ہے اور نہ رسول اللہ کی طرف منسوب کردہ سنت میں۔ وہ قرآنی آیات کا مفہوم بھی ایسا بیان کرتا ہے جو نہ عربی زبان کی رو سے درست ہو اور نہ ہی تعلیم قرآن کے مطابق۔ اس مفہوم کے لئے سند، اس کا کشف ہے جس کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ جس وقت آپ نے کسی کی بیعت کر لی بس اس کے بعد علم و عقل کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی آپ پر حرام ہو گیا۔ اب پیر کا ہر حکم بلا سند خدا کا حکم ہے۔ اس کے ایک لفظ پر بھی تنقید نہیں کی جا سکتی لب کشائی تو ایک طرف دل میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ پیر، دل کی لغزشوں اور نگاہ کی خیانتوں تک سے، حاضر و غائب، واقف ہے۔ وہ تمام خدائی صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ اگر وہ ناراض ہو گیا تو دنیا اور عاقبت دونوں خراب ہو گئیں۔ اس کے بعد کہیں ٹھکانا نہیں، کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر نہ کوئی انسان اس کی مدد کر سکتا ہے اور نہ خدا ہی۔ ہم اس وقت نہ تو تصوف کی تاریخ لکھ رہے ہیں اور نہ ہی یہ بتانا مقصود ہے کہ خود تصوف ہی کس قدر غیر اسلامی نظریہ ہے۔ ہم اس وقت صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام، جو انسان کو ہر قسم کی انسانی اطاعت سے آزاد کرانے آیا تھا، اسی اسلام کے نام پر کس طرح انسانی غلامی کی شدید اور بدترین اقسام کو عین دین بنا لیا گیا ہے۔ قرآن یہ کہنے آیا تھا کہ اور تو اور، کسی رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسانوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ وہ خود بھی احکام خداوندی کی اطاعت کراتا ہے۔ لیکن وہی اسلام، پیر پرستی میں ایسا مسخ ہو گیا کہ پیر کے کسی حکم کے لئے نہ قرآن کی ضرورت ہے نہ عقل و بصیرت کی دلیل کی حاجت۔ ملوکیت کا استبداد انسان کے جسم تک ہی محدود ہوتا ہے۔ لیکن پیر پرستی کے استبداد کو دیکھئے کہ یہ دل و دماغ پر مستولی، رگ و ریشہ میں اترا ہوا اور قلب و روح پر چھایا ہوا ہے۔ اگر پیر کی عظمت کے خلاف دل میں بھی کوئی خیال گزرتا ہے تو یہ ڈرتا ہے، لرزتا ہے، کانپتا ہے۔ انسان ملوکیت کی غلامی سے ہر وقت بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ اگر پیر کسی کو اپنے آستانے سے دور ہو جانے کا حکم دیتا ہے تو روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، دنیا بھر کی سفارشیں لاتا ہے، سجدے کرتا ہے، ناک رگڑتا ہے کہ حضور! مجھے راندۂ درگاہ نہ بنایئے، میں دنیا اور آخرت میں کہیں کا نہیں رہوں گا! میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میں برباد ہو جاؤں گا۔ مومن کی شان یہ تھی کہ اسے دنیا میں، اپنے خدا کے سوا، کسی اور کا ڈر نہ تھا۔ قرآن نے خوف کا نشیمن شرک کا قلب بتایا تھا، لیکن اسی قرآن کے ماننے والوں کی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ خود اپنے جیسے انسانوں کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن بار بار کہہ رہا ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ ۔ جنہیں تم خدا کے

درے ہی پکارتے ہو وہ تو خود تمہارے جیسے انسان ہیں۔ لیکن یہ انہیں اپنے جیسے انسان نہیں بلکہ خدا مانتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ نہیں یہ غلط ہے۔ پیر کو خدا نہیں مانا جاتا۔ لیکن آپ دیکھئے کہ لفظاً اگر اسے خدا نہیں کہا جاتا تو کیا معناً اسے خدا نہیں مانا جاتا۔ خدا نے کہا تھا کہ دنیا میں کسی کو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت حاصل نہیں۔ پیر کے متعلق یہ ایمان ہوتا ہے کہ نفع اور نقصان کی ساری طاقتیں اس کے قبضہ میں ہیں۔ حتیٰ کہ وہ انسانی تقدیر کو بھی بدل سکتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ پیر پرستی کی بنیاد ہی اس عقیدہ پہ ہے۔ اگر یہ عقیدہ نکال دیا جائے کہ پیر کو نفع و نقصان کی قدرت حاصل ہے تو پیر پرستی آج ختم ہو جائے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ہم پیر کی اطاعت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا تک پہنچا دے۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ جب مشرکین سے پوچھئے کہ تم اپنے پیروں کی پرستش کیوں کرتے ہو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم انہیں خدا نہیں مانتے بلکہ انہیں تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا
إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (۳۹/۳)

جو لوگ اللہ سے ورے ہی لوگوں کو اپنا کارساز بنا لیتے ہیں (جب ان سے پوچھئے تو وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔

کہتے ہیں کہ ہم پیر کو معرفت الٰہی کا وسیلہ بناتے ہیں اور اس کے لئے یہ آیت بطور سند پیش کرتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (۵/۳۵)

اے ایمان والو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔

حالانکہ یہی آیت ان کے اس دعوے کی تردید کرتی ہے۔ اوپر کا حصہ آیت کا آدھا ٹکڑا ہے۔ باقی حصہ اس وسیلہ کی تشریح کر رہا ہے کہ

وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

یعنی اس کے راستے میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

یعنی تقرب الٰہی کا حقیقی وسیلہ جس کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ ہے کہ راہ حق میں، باطل کے خلاف جہاد کیا جائے نہ یہ کہ کسی انسان کا دامن تھام کر بیٹھ جائے۔ خدا تک پہنچنے کے لئے انسانی توسل خالص شرک ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ (خدا کیا ہے؟ انسان اور خدا کا تعلق کیا ہے۔ قرب الٰہی کسے کہتے ہیں؟ اس سے انسان کے شعور میں کیا انقلاب آتا ہے۔ یہ تمام مباحث الگ ہیں۔

ان پر اس وقت بحث نہیں ہو سکتی۔ ان کا صحیح مقام معارف القرآن ہے۔) قرآن، اللہ اور بندے کے درمیان کسی حاجب اور دربان کو جائز قرار نہیں دیتا۔ خدا ہر بندۂ مومن سے کہتا ہے کہ ادعونی استجب لکم، تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ وہ کہتا ہے کہ امن یجیب المضطر اذا دعاہ "وہ کون ہے جو کسی بے قرار کی پکار کا جواب دیتا ہے؟" ء الٰہ مع اللہ۔ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہے جو ایسا کر سکتا ہے؟

اِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ

اور جب میرے بندے میری بابت تجھ سے پوچھیں تو کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارے۔

باقی رہا یہ کہ ہم رشد و ہدایت حاصل کرنے کے لئے مرشد و ہادی کی تلاش کرتے ہیں سو یاد رکھئے کہ یہ ایت قرآن میں آچکی۔ ظاہر، باطن، شریعت، طریقت سب کچھ وہی ہے۔ خدا سے ملنے کا راستہ بھی وہی ہے جسے خدا ہی نے صراط مستقیم کہا اور جسے خود نبی اکرمؐ نے اُمّت کو دکھا دیا۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ کوئی چور دروازہ نہیں جس کے راستے کوئی دوسرا خدا تک لے جائے اور یہ راستہ صرف اسی طرح ملتا ہے کہ تمام انسانوں کی غلامی کا طوق اتار کر صرف خدا کی غلامی اختیار کر لی جائے۔ یہی خود رسول اللہؐ نے کیا اور اسی کے کرنے کا حکم دیا۔

إِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ (آل)

میرا اور تمہارا رب وہی اللہ ہے، اسی کی غلامی اختیار کرو۔ یہ ہے صراط مستقیم۔

اس کے علاوہ اور کوئی "راز" نہیں جو حضورؐ خفیہ خفیہ کسی ایک کو بتا گئے ہوں کہ یہ چیز تبلیغ رسالت کے منافی تھی جس کے لئے حضورؐ مامور تھے۔ حضورؐ کو ارشاد تھا کہ بلغ ما انزل الیک، یعنی جو کچھ تم پر نازل کیا جاتا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو۔ چنانچہ حضورؐ نے یہ سب کچھ لوگوں تک پہنچا دیا اور آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اقرار بھی لے لیا کہ آپ نے سب کچھ پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ حضورؐ نے "مغز دین" عوام تک نہیں پہنچایا تھا بلکہ وہ چپکے چپکے خواص کو بتایا تھا جو پھر اسی طرح آگے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ (نعوذ باللہ) ذات رسالت مآبؐ کے متعلق کیا خیال پیدا کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آتی اور یہ عقیدہ رکھے جا رہے ہیں کہ دین کا ایک حصہ (جو درحقیقت اصل دین ہے) حضورؐ نے لوگوں سے چھپا کر چپکے سے کسی کے کان میں کہہ دیا تھا۔ اور وہ کانوں کان آگے چلا آ رہا ہے۔ باقی رہی بزرگوں کی تعظیم تو بلاشبہ تمام وہ اسلاف جنہوں نے دنیا میں قوانین الٰہیہ کو قوت نافذہ بنا کر چلایا، اس قابل ہیں کہ ان کے کارناموں کی یاد قائم رکھی جائے۔ ان کی مبارک زندگیاں ہمارے لئے تقویت ایمان کا موجب ہیں، اس لئے کہ انہوں نے دنیا کو بتا دیا کہ اس کی تمام طاغوتی قوتوں کے خلاف مسلسل جہاد

سے کس طرح حق کا غلبہ قائم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ایک اللہ کا ہو کر سارے جہان کی غلامی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے تمام دنیا کی مخالفت کے باوجود بڑے بڑے کفر و الحاد کے مرکزوں میں قرآن کی روشنی راہ گم کردہ انسانوں تک پہنچائی، اور دنیا میں خدائی حکومت کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔ اعمالِ صالحہ دنیا میں روشنی کے میناروں کی طرح محکم و استوار کھڑے ہیں کہ حوادثِ زمانہ کی نامساعد موجیں آئیں اور ان سے ٹکرا کر لوٹ جائیں۔ وکذٰلک نجزی المحسنین۔

لیکن تنظیم اور تعبد کے باریک فرق کو بھول جانے سے صحیح راستہ گم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسے کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔

مُردہ پرستی

پیر پرستی کی غلامی کا طوق پیر کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کی مملکت ابدی ہے۔ مرنے کے بعد وہ اسی طرح قلب و دماغ پر چھایا رہتا ہے جیسا کہ زندگی میں بلکہ اب اس کی گرفت پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے کہ اب وہ دربارِ خداوندی کا حاضر باش تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ عقیدہ "وصال بالحق" کی رو سے تو وہ خدا میں مل کر خود خدا بن جاتا ہے۔ وہ تمام مریدوں کے حالات سے باخبر ہوتا ہے، ہر ایک کی دعائیں سنتا ہے، ان کی مشکل کشائی کرتا ہے، مصیبت میں بعض اوقات بنفسِ نفیس تشریف لا کر حاجت روائی کرتا ہے۔ غرضیکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کو کرنا چاہیئے تھا اب اس کی جگہ پیر صاحب کرتے ہیں۔ حالانکہ مُردوں کے متعلق قرآن کریم کا کھلا کھلا فیصلہ ہے کہ یوم بعث تک وہ کسی دنیا والے کی سننے اور جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔

إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ ۚ
وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ (۳۵/۱۴)

اور اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر بفرضِ محال سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے دن وہ تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے۔

ان کو اتنا بھی علم نہیں کہ وہ کب قیامت کے لئے اٹھائے جائیں گے۔

"اور جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ خود مخلوق ہیں مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں، اور اتنی بھی خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے (۱۶/۲۱)۔

ماضی پرستی

ہم نے جس قدر پرستشیں گنائی ہیں، اگر آپ بنظرِ تعمق دیکھیں گے تو ان میں ایک چیز بطور قدرِ مشترک نظر آئے گی، اور وہ ماضی پرستی ہے۔ یہی ان تمام غلط عقائد کی اصل ہے۔ اسلام مستقبل کو درخشندہ و تابناک بنانے والا دین تھا لیکن انسانی دماغ نے جس مذہب کی تشکیل کی وہ تو بہرکیف انسانی مذہب ہی ہو سکتا تھا جس کی رو سے ہمیشہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج بڑا تاریک ہے اور گزشتہ کل بڑا روشن تھا۔ یہ کلجگ ہے اور وہ ست جگ تھا۔ آپ آج

سے پیچھے ہٹتے جائیے اور ہر ایسے بزرگ کی تصنیف اٹھائیے جس کا عہد آپ کے نزدیک بڑا مقدس اور نورانی تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ بھی یہی گلہ کرتے ہوں گے کہ ہمارا زمانہ بڑا تاریک ہے اور گزشتہ زمانہ بڑا تابندہ تھا۔ ذہنِ انسانی کی کچھ افتاد ہی ایسی ہے، اور اسی افتاد کا نتیجہ ہے کہ جو شئے گزشتہ زمانہ سے متعلق ہو واجب التعظیم ہو جاتی ہے۔ اکابر پرستی، اسلاف پرستی، مردہ پرستی، سب اسی ماضی پرستی کی مختلف شاخیں ہیں اور جب تک ماضی پرستی کا تخیل درست نہ ہوگا، حقائق پرستی کبھی نہیں آئے گی۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی پرستی سے بے نیاز ہو جائیں۔ ماضی ہمارے آباؤ اجداد کی وراثت ہے ہم اُس سے متمتع کیوں نہ ہوں۔ لیکن ماضی کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ہر ایک فن عہدِ ماضی میں اپنی تکمیل کو پہنچ گیا اور ایسا مکمل ہو گیا کہ اس میں کوئی نقص، کوئی کمی باقی نہیں رہی نہ اس پر اضافہ ہو سکتا ہے، نہ ترمیم ہو، نہ اس پر تنقید ہو سکتی ہے، نہ تنقیح، یہ ہے ماضی پرستی۔ دین یقیناً مکمل ہو چکا۔ اس اعتبار سے عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہ کبارؓ نوعِ انسانی کی تاریخ میں اسلام کے صحیح مظہر کا دور ہے کہ جس دور میں قرآن کے احکام زندگی کا عملی دستور بنے تھے۔ لیکن قرآن تو کتابِ فطرت ہے۔ جس طرح فطرت کے رازہائے سربستہ ذہنِ انسانی کے نشوونما اور ارتقاء کے ساتھ بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں اور فطرت کی کوئی شئے کسی مقام پر بھی جا کر یہ نہیں کہہ دیتی کہ بس اب مجھ میں مزید تحقیق بیکار ہے، میرے سینے میں جس قدر گہر ہائے آبدار موجود تھے وہ سب باہر آ چکے ہیں، اسی طرح قرآن کریم کے حقائق بھی عقلِ انسانی کے ساتھ ساتھ معلوم ہوتے جائیں گے، اور چونکہ یہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے آخری کتاب ہے اس لئے جب تک دنیا میں انسان باقی ہیں، یہ اُن کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق سامانِ ہدایت دیتی چلی جائے گی۔ اسی اعتبار سے ہم کہتے ہیں کہ قرآن کسی خاص ماحول میں مقید نہیں ہو سکتا۔ لیکن ماضی پرستی ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے اور یہی ہے وہ چیز جس سے دماغ پر بریت کی سلیں رکھی جاتی ہیں، عقلیں معطل ہو جاتی ہیں، قوائے عمل مضمحل ہو جاتے ہیں، فکر و نظر کی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ کبھی قدم اٹھتے بھی ہیں تو سمت کا رُخ چونکہ پیچھے کی طرف ہوتا ہے اس لئے ہر قدم منزل سے اور بعید ہو جاتا ہے۔ قومیں آگے بڑھتی ہیں اور یہ قوموں کے امام پیچھے جاتے ہیں۔ دنیا اوپر کو اُبھرتی ہے اور دنیا کے پیشوا نیچے کو جاتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں اتنی بوجھل زنجیریں ہیں کہ وہ انہیں اوپر اٹھنے ہی نہیں دیتیں۔ جن قوموں میں دین رسوم پرستی بن کے رہ گیا (اور یہ ماضی پرستی ہی کا دوسرا نام ہے)، وہ قومیں کبھی اُبھر نہیں سکیں۔ انہوں نے کبھی ابھرنا بھی چاہا تو چونکہ اُن کا اصل دین اُن سے گم ہو چکا تھا اس لئے انہیں سہارا دینے کی کوئی چیز نہ مل سکی۔ لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ اُن کے خدا کی کتاب زندہ ہے، اور یہ قوم پھر مردہ کی مردہ۔ سچ ہے زمینِ شور پر ابرِ رحمت کیا گہرباری کرے گا۔ وتلک الامثال نضربها للناس لعلهم یتفکرون

حقائق پرستی | آپ نے غور فرمایا کہ تمام پرستشیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس لئے پیدا ہو گئیں کہ مسلمانوں

نے بھی دیگر مذاہب کے متبعین کی طرح، حقائق پرستی چھوڑ کر شخصیت پرستی اختیار کر لی۔ حالانکہ ان کے پاس حقائق ازلی کا مکمل دستور اپنی اصلی صورت میں موجود تھا اور انہیں اس کو چھوڑ کر کسی ظن و تخمین کے اتباع کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مصیبت یہ ہوئی کہ علوم و فنون کی نشر و اشاعت زیادہ تر عہد عباسیہ میں ہوئی۔ اس زمانہ میں مرکز اسلام پر یکسر عجمیت غالب آ چکی تھی اور مشاہیر پرستی عجمیوں کی فطرت میں داخل تھی۔ اس لئے اگر ایک طرف بادشاہ ظل اللہ قرار دیا گیا تو دوسری طرف ائمہ مذہب کی پرستش بھی کسی کم درجہ میں نہیں کرائی گئی حالانکہ ظاہر ہے کہ تنقید کی حد سے بالا صرف وہ چیزیں ہو سکتی ہیں جن پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف ہیں نہ کہ جزانسان۔ اللہ اور اس کا رسول اور اس کی کتاب بلاشک و شبہ تنقید کی حد سے بالاتر ہیں۔ لیکن کسی اور انسان پر ایمان لانا تو کہیں نہیں لکھا، اس لئے ان کو تنقید سے بالا کیوں سمجھا جائے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جس قسم کی غلط عقیدت و ارادت ہمارے دلوں میں بزرگان سلف سے پیدا ہو چکی ہے اور جو صدیوں سے متواتر چلی آتی ہے اس کو صحیح اور جائز عقیدت اور ارادت سے بدل دینا آسان نہیں۔ ذہنی غلامی کے جو طوق و سلاسل مسلمانوں نے اپنی گردنوں میں پہن رکھے ہیں اور جن کے وہ اب اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ وہ گویا فطرت ثانیہ بن چکے ہیں، ان کا اتار پھینکنا محال معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جب کسی تیتر کو ایک مدت تک پنجرہ میں بند رکھا جائے تو وہ پھر اس قفس کا اس درجہ عادی ہو جاتا ہے کہ اس کا مالک اسے پنجرہ کے باہر کھلا چھوڑ دیتا ہے، خود پنجرہ لے کر آگے آگے چلتا ہے اور وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہے اور چونچیں مار مار کر اس کا دروازہ کھولتا ہے۔ حالانکہ اس کے بازوؤں میں قوت بھی ہوتی ہے اور آزادی کی فضا کے سیدا اس کی آنکھوں کے سامنے۔ لیکن اس کے نزدیک جو آرام قفس کے گوشہ میں ہوتا ہے کھلی فضا میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ کھلی فضا کو غیر فطری چیز سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح مدتہائے دراز کی ذہنی غلامی سے ہم اس درجہ خوگر بند و سلاسل ہو چکے ہیں کہ ان کے اتار دینے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ایک متاع گراں بہا چھنی جا رہی ہے، دین ہم سے چھینا جا رہا ہے۔ عاقبت خراب ہو رہی ہے لیکن یہ سب ہمارے قلوب کے وساوس ہیں، ذہن کے چھلاوے ہیں۔ جس چیز کو ہم حقیقت سمجھ رہے ہیں وہ حقیقت نہیں۔ جو ہمیں ہدایت نظر آتی ہے وہ ہدایت نہیں، دھوکہ ہے۔ فریب ہے۔ اور یہ اس لئے کہ

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِيْنٌ

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۴۳/۳۶-۳۷

جو شخص خدا کے ذکر (قرآن) سے اندھا بن جاتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ شیاطین، ان کو راہ سے گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ روکتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سیدھے راستے پر ہیں۔

آخر میں حضرات "علمائے کرام" کی خدمت میں با ادب گزارش کروں گا کہ وہ تصریحات بالا پر ٹھنڈے

دل سے غور فرمائیں اور دیکھیں کہ قرآن کریم کی تعلیم ہمیں کدھر بلا رہی ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ان حضرات کو شکایت ہے کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ دین سے بیگانہ ہوتا چلا جا رہا ہے یہ حقیقت ہے لیکن ان حضرات نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیونکہ یہ حضرات عملی دنیا سے بالعموم الگ رہتے ہیں اس لئے انہیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ الحاد و بے دینی کی اس رو کا سرچشمہ کہاں ہے؟ یہ دین کی اتنی ہی خدمت اور ان برائیوں کا صرف اسی قدر علاج کافی سمجھتے ہیں کہ اپنے مواعظ و فتاویٰ میں ان لوگوں کو مردود و ملعون قرار دیدیا جائے۔ لیکن اس سے اصلاح تو نہیں ہو سکتی۔ اس سے تو مرض اور بڑھ جاتا ہے۔ مجھے نوجوانوں کی ایسی جماعت سے خلا ملا کا بہت موقع ملتا ہے۔ درحقیقت میری زندگی ہی ان میں گزری ہے۔ اس لئے میں نے ان کی ذہنی افتاد اور رجحانات قلبی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان میں سے بہتوں کے ساتھ یہ ہوا کہ ان کی فطرت صحیحہ نے مذہبیات کے اس حصہ سے بغاوت کرنی چاہی جو انسانوں کا وضع کردہ ہے، لیکن ان پر جبر کیا گیا کہ وہ اسے بھی دین خداوندی سمجھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس حصہ سے بھی بغاوت کرنے لگے جو فی الواقع خدا کی طرف سے تھا۔ چنانچہ مجھے کئی ایک ایسے نوجوانوں سے سابقہ پڑا جو اسی طرح ہمارے حامیانِ دین کے بگاڑے ہوئے مریض تھے۔ میں نے ان "علما گزیدہ" نوجوانوں کے سامنے آہستہ آہستہ وہ دین پیش کیا جو فی الحقیقت دین ہے، تو میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت کے گرویدہ ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے آج اکثر ایسے ہیں جو اپنی بیشتر مساعی خود دین کی مدافعت میں صرف کر رہے ہیں میں نے ایسا کرنے میں قطعاً یہ نہیں کیا کہ جدت پسند طبقہ کی طرح قرآن کریم کی دور از کار تاویلات کی جائیں اور ان کے ذہنی و قلبی رجحانات کی رعایت سے حقیقت کو ان سے چھپایا جائے۔ میں نے صرف یہ کیا کہ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن سے اور اس کی عملی مثال اسوۂ رسول اللہ سے جو خود قرآن کے اندر موجود ہے ان کے سامنے رکھدی اور اس کے بعد بتا دیا کہ کوئی نظریہ یا قول خواہ زمانہ جدید سے متعلق ہو یا قدیم سے، اس کسوٹی پر پورا نہ اترے وہ کبھی حقیقت ثابتہ نہیں ہو سکتا۔ حقیقت صرف یہی ہے اور یہی دین ہے۔ چنانچہ اس کے نتائج بڑے اطمینان بخش ظاہر ہوئے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور ایک ایسے ماحول کا تجربہ ہے، جسے یکسر "یورپ زدہ" ماحول کہنا چاہیئے۔ اور جس کے ہاتھوں مولوی صاحبان اس درجہ نالاں ہیں۔ اور یہی تجربہ ہے جو ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا۔ یہ وہ بصیرت ہے جو مجھے قرآن سے حاصل ہوئی۔ میں اپنے فہم قرآن کو کبھی سہو و خطا سے مبرا نہیں سمجھتا۔ میں اپنی ہر غلطی کی اصلاح کے لئے ہر وقت تیار ہوں بشرطیکہ وہ غلطی قرآن ہی سے ثابت کی جائے۔ ان الھدیٰ ھدی اللہ و فیھا بصائر للناس و ھدی و رحمۃ لقوم یوقنون

مجھے ضرورت ہے

عربی زبان کے اس لغت کی جس کا نام

Lane's Lexicon

ہے۔ یہ سات آٹھ جلدوں میں ہے۔
اگر یہ لغت کسی کتب فروش کے پاس ہو۔ یا کسی اور صاحب کے پاس جو فروخت کرنا چاہیں، تو براہ کرم مجھے اطلاع دیں۔ اگر کوئی صاحب مجھے اتنا ہی بتا سکیں کہ یہ لغت کس کے پاس ہے تو میں شکر گزار ہوں گا۔ والسلام

پرویز

۲۳/۱ - فاؤلرز لائن - نیپئر بارکس - کراچی ۴

استحکامِ پاکستان

قراردادِ مقاصد کی روشنی میں

کیوں نہ ہوں سرشار پاکستان کے انعام سے
جب قرارِ زندگی ہے اس کے استحکام سے

آج دل ہے پُر امید اُس کام کے انجام سے
کل ہی جس کی ابتدا کی تھی خدا کے نام سے

منزلِ مقصود جب اپنی معین ہو گئی
پھر تعجب ہے جو ہم بیٹھے رہیں آرام سے!

دور ہو جائے دلوں سے دین و دُنیا کی دوئی
ہو اگر دانشِ مشرق دولتِ اسلام سے

اُس تمدّن کو بھی کیا تہذیب کہنا چاہیئے
جس کا دامن سُرخ ہو انساں کے قتلِ عام سے

ساز و ساماں پر مغرور ان کو ہمیں ایماں پہ ناز
ملت اپنی مختلف ہے دوسری اقوام سے

اُن کی آزادی کے محور صرف اُن کی خواہشات
اپنی آزادی فقط پابندیِ اسلام سے

اپنی آزادی کہاں جب تک نکل سکتے نہیں
غیر اسلامی تخیّل کے طلسمی دام سے

اپنی آزادی کہاں جب تک نہ باز آجائیں ہم
امتزاجِ حق و باطل کے خیالِ خام سے

خود نمونہ بن کے پھر آگاہ کرنا ہے ہمیں
ساری دُنیا کو رسول اللہ کے پیغام سے

ہے اسدؔ اپنے لئے سرچشمۂ قوّت یہی
پختگی حاصل کریں قرآن کے احکام سے

اسدؔ ملتانی

THE ISLAMIC LITERATURE

A MONTHLY RELIGIOUS JOURNAL IN ENGLISH WITH A DIFFERENCE

To be a measure to collect, gradually, the scattered forces of Islamic Renaissance, which in no distant future is to serve as the foundation of that new world order for which there is a cry everywhere but about the nature of which nobody is clear yet.

While the rest of the world fights on things sordid, let us inspire the denizens of the world with a higher vision of life.

Your active co-operation is needed.

SUBSCRIPTION :

Rs. 12/- a year ; Rs. 7/- for six months

Send Rs. 1/4/- for specimen copy.

Shaikh Muhammad Ashraf

Sponsor : THE ISLAMIC LITERATURE

Kashmiri Bazar, Lahore

اسبابِ زوالِ اُمت

(وقت کا ایک اہم سوال)

(عنوانِ بالا پر جو سوال طلوعِ اسلام کے صفحات پر اٹھایا گیا ہے، اس کے متعلق، دہلی کو شائع ہونے والے ماہوار مجلہ برہان نے اپنی اشاعت بابت اگست ۱۹۶۳ء میں، افتتاحیہ شائع کیا ہے۔ برہان، ندوۃ المصنفین کا پرچہ ہے جو نیشنلسٹ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا طلوعِ اسلام میں زیرِ بحث سوال کے متعلق اس کا جو طریق نگاہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ تقسیم سے پیشتر ایسے جرائد و رسائل کی طرف سے طلوعِ اسلام کے مسلک و دعوت کی مخالفت ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی۔ اس لئے برہان کا موجودہ طرزِ عمل ہمارے لئے وجہِ تعجب نہ تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہی نہیں بلکہ تاسف ہوا کہ ان مجلات کی اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجو دہن بگڑا

برہان میں شائع شدہ "نظرات" جب محترم حکیم ابوالنظر صاحب رضوی امروہوی کی نگاہ سے گذرے تو انہوں نے ان پر تبصرہ تحریر فرما دیا جسے ہم بلا مزید تنقید و تبصرہ شائع کرتے ہیں۔ پہلے برہان کے نظرات ملاحظہ فرمایئے اور اس کے بعد محترم رضوی صاحب کا تبصرہ۔ طلوعِ اسلام سرِدست اس سوال سے متعلق مباحث پر خود کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔ طلوعِ اسلام)

نظراتِ برہان

"آج کل "وقت کا ایک اہم سوال" کے عنوان سے بعض اخبارات و رسائل میں ایک سوال کا چرچا ہو رہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "مسلمان آج کل ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ حالانکہ قرآن مجید میں ان کے لئے دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبود وعدہ ہے"۔ اس سوال کو وقت کا ایک اہم سوال کہا گیا ہے جس پر اربابِ قلم اپنی قوتِ خامہ فرسائی اور زود نویسی کا مظاہرہ کر رہے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ سوال انتہائی تعجب انگیز بھی ہے اور حد درجہ افسوسناک و شرمناک بھی!

تعجب انگیز اس لئے کہ مسلمانوں پر جو مصائب و آفات نازل ہوئے ہیں اور اب وہ جس شکنجۂ بیم و رجا میں کسکر رکھ دیئے گئے ہیں ان کی درد انگیزی و مہیب ناکی کا تقاضا تھا کہ ان کی آنکھ کھل جاتی اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کے باعث آج ان کو یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے لیکن اگر ان کو اب بھی ان اسباب کا احساس نہیں ہوا جیسا کہ یہ اہم سوال پیش کرنے سے معلوم ہوتا ہے تو ان کی اس بے حسی و بے خبری کا ماتم جتنا بھی کیا جائے کم ہے۔ گویا ان کی مثال اس بدنصیب انسان کی ہے جو زہر کی پھنکی مارنے کے بعد سکراتِ موت سے دوچار ہے۔ ہاتھ پاؤں سے دم کھنچ کھنچ کر سینہ کی طرف آ رہا ہے، نبض چھوٹ گئی ہے، سانس اکھڑ چکا ہے اور زندگی کے در و دیوار پر موت کا بھیانک سایہ دراز ہوتا جا رہا ہے اور اس کے باوجود اس شخص کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اسے موت کیوں آ رہی ہے؟ اور وہ سوچتا ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں تو بڑے مضبوط تھے اور اس کی تندرستی پر لوگوں کو رشک آتا تھا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ اسے یک بیک موت نے آدبوچا ہے۔

ایک انسان اگر زہر کو زہر سمجھ کر کھاتا ہے اور اس کے بعد اس پر موت کے آثار طاری ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو اسے ذرا شک ہوتا ہی نہیں اور وہ اعضاء کی تشنجی کیفیت محسوس کرتے ہی یقین کر لیتا ہے کہ زہر نے اپنا کام شروع کر دیا ہے لیکن اگر اس نے زہر کو دوا یا کسی چیز کے دھوکہ میں کھا لیا ہے تب بھی جب اس چیز کے کھاتے ہی اس پر آثارِ مرگ طاری ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو اب اس کو یہ خیال خود پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوا کے یا کسی اور چیز کے دھوکہ میں زہر کھا گیا ہے پھر اس کا یہ خیال یقین سے بدل جاتا ہے جب ایک دو ڈاکٹر بھی اس کی تصدیق کر دیتے ہیں کہ واقعی ایک نہایت مہلک قسم کا زہر کھا گیا ہے۔ پس آپ اس بدنصیب کو کیا کہیں گے جس کی صورتِ حال یہ ہو کہ جب وہ زہر کو کسی عمدہ اور مفید چیز کے دھوکہ میں کھا رہا تھا اس وقت ایک دو نہیں بیسیوں تجربہ کار ڈاکٹروں نے، سینکڑوں مخلص اور خیر خواہ دوستوں نے اور جاں نثار عزیزوں اور رشتہ داروں نے پکار پکار کر اور چیخ چیخ کر خبردار کیا کہ اس نے جو شیشی اٹھائی ہے وہ دوا کی نہیں زہر کی شیشی ہے اور اس کے استعمال سے اس کا مرض دور نہیں ہوگا بلکہ وہ اور موت کی گود میں جا پڑے گا۔ لیکن اس بدقسمت نے کسی کی ایک نہیں سنی۔ اس نے سب کی تغلیط کی، سب کو احمق اور بے وقوف کہا۔ اور صرف اس قدر ہی نہیں بلکہ ان سب کو اپنا بدخواہ اور دشمن بھی جانا اور سب کے منع کرنے کے باوجود زہر کو پی گیا۔ اب اس کے بعد ان تیمارداروں کے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ کوئی پوچھے تو اس "مرحوم" کی طرف اشارہ کر کے کہدیں کہ

"جان دیدی لاکھ سمجھاتے رہے"

تعجب انگیز ہونے کے علاوہ یہ سوال حد درجہ افسوسناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔ اور یہ اس لئے کہ ان مصائب و آفات کے بعد بھی اگر مسلمانوں کو اپنی بدعملیوں اور احکام خداوندی کی نافرمانیوں پر متنبہ نہیں ہوتا اور اس بنا پر وہ بجائے منفعل، نادم اور خدا کے حضور میں شرمسار و تائب ہونے کے ابھی یہ ہی پوچھ رہے ہیں کہ یہ مصائب کیوں آئے اور ان کی یہ حالت کس لئے ہو گئی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ گویا قدرت کو ظالم بتا رہے ہیں اور بالواسطہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ قدرت کو مسلمانوں سے ہی کوئی خاص عناد ہے کہ جب کبھی ہندوستان میں کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے خواہ وہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہو یا ۱۹۴۷ء کا بہرحال اس کا نتیجہ غیر مسلموں کے حق میں بہتر ہوتا ہے اور مسلمانوں کے حق میں برا۔ غیر مسلموں کی بن آتی ہے اور مسلمانوں کی بنی بنائی بگڑ جاتی ہے۔ آپ پر اگر کوئی مصیبت آئی ہے تو اب آپ کے لئے صرف دو ہی راہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کھلے اور صاف لفظوں میں اس کا اقرار کیجئے کہ یہ مصیبت آپ کے اپنے ہاتھوں آئی ہے اور اس کی پوری ذمہ داری آپ کے سر ہے اور اگر آپ اس اقرار کے لئے آمادہ نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مصیبت اور آفت کے مستحق نہیں تھے لیکن اس کے باوجود قدرت نے آپ کو اس میں مبتلا کر دیا۔ تو گویا قدرت ظالم ہوئی، ستمگر اور بے انصاف ہوئی۔ ظاہر ہے کہ قدرت کو ایسا ناپاک الزام دینا مسلمان تو مسلمان کسی ادنیٰ درجہ کے انسان کا بھی کام نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں دو ہی باتیں بالکل صاف صاف ہیں ایک یہ کہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا (چہ جائیکہ وہ اپنے نام لیواؤں اور اپنے حبیبؐ کے غلاموں پر ظلم کرے) اور دوسری یہ کہ جو جیسا کرتا ہے (وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم) ویسا پاتا ہے اور نیز یہ کہ تم پر جو مصیبت آئی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں آئی ہے۔

کہا جاتا ہے ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو مارا، لوٹا، برباد کیا اور اب بھی مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں وہ انہیں لوگوں کی وجہ سے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں پر ان ظالموں کو مسلط کس نے کیا؟ وہ کون ہے جس نے ان کو قوی بنا دیا اور مسلمانوں کو اس درجہ کمزور کہ وہ اپنی عزت و آبرو اور جان و مال کی طرف سے مدافعت بھی نہیں کر سکے؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہے کہ قدرت نے ایسا کیا؟ اور مشیت خداوندی نے ایسا ہی چاہا؟ اب سوال یہ ہے کہ قدرت نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا لامحالہ جواب یہ ہے کہ مسلمان اپنے اعمال و افعال اور اپنے فکر و نظر کے اعتبار سے یُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اس سزا کا مستحق تھا اور عدلِ ایزدی کا یہ ہی تقاضا تھا اور اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر وہ ہی قدرت پر بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے اور قدرت ان تمام چیزوں سے بلند و بالا اور ماورا ہے۔

دیکھئے! حضرت موسیٰؑ نے قارون اور اس کے ساتھیوں کو ہزار سمجھایا کہ اللہ کی زمین پر گھمنڈ نہ کرو اور اس کے سوا کسی غیر کا سہارا مت پکڑو۔ مگر جب وہ نہیں مانا تو آخرکار خدا نے قارون اور اس کے ہمراہیوں کو مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا کر کے ختم کر دیا۔ قرآن میں اس واقعہ کا بیان اس طرح ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ فَمِنْهُمْ مَنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُمْ مَنْ أَغْرَقْنَا

بے [illegible] موسیٰ ان لوگوں کے پاس کھلی کھلی باتیں لیکر پہنچے لیکن انھوں نے دنیا میں گھمنڈ کیا حالانکہ وہ برائی میں خدا سے آگے نکل جانے والے نہیں تھے۔ پس نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان سب کو ان کے اپنے اپنے گناہ کی پاداش میں دھر لیا۔ چنانچہ کسی پر پتھراؤ کیا۔ کسی کو سامعہ نے پکڑ لیا۔ کسی کو زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔

عذاب کی ان [illegible] قسموں [illegible] ذکر کے بعد ارشاد ہے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ

اور [illegible] تھا بلکہ ان لوگوں نے تو خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔

بعض [illegible] میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ ہوا وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے [illegible] ابتلا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں نے اس پر صبر کیا تو آخرت میں ان کے مدارج [illegible] زیادہ بلند ہوں گے اور ان کی نیکیوں میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کا خیال سراسر شیطان کا دھوکہ اور نفس کا فریب ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کو نہ تباہی و بربادی کے ان اسباب سے توبہ کی توفیق ہو اور نہ آئندہ کے لئے انھیں اپنی حالت سدھارنے اور اس کی اصلاح کرنے کی جانب متوجہ ہو۔

جو شخص اسلامی تعلیمات اور اس کی روح سے واقف ہے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں تامل نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ ہوا وہ اور موجودہ حالت یہ دونوں اللہ کی طرف سے مسلمانوں پر ایک نہایت شدید قسم کا عذاب ہے ابتلا یا آزمائش ہرگز نہیں ہے۔

ابتلا اور عذاب ان دونوں کی ظاہری شکل میں اگرچہ یک گونہ مشابہت ہوتی ہے لیکن درحقیقت دونوں میں بنیادی اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ ابتلا میں انسان کو واقعہ کے اسباب و علل پر اختیار نہیں ہوتا جو کچھ ہوتا ہے اچانک ہوتا ہے اور بالکل غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے۔ شخص مبتلیٰ بہ کو ان اسباب کی تخلیق و تعمیر میں دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف عذاب کی صورت یہ ہوتی ہے کہ عذاب میں گرفتار ہونے والا

خود ان اسباب کو پیدا کرتا ہے۔ اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کو اسباب کی اس نوعیتِ خاص کا علم بھی تھا یا نہیں۔ مثلاً ایک شخص قاعدہ میں چلتا چلتا اچانک پھسل پڑے اور اس سے چوٹ لگ جائے تو یہ ابتلا ہے اور اگر ایک شخص گیلی اور پھسلواں زمین پر بے تحاشا دوڑا جا رہا ہے اور وہ دوڑتے دوڑتے گر جائے اور ہاتھ پاؤں کو زخمی کر لے تو یہ ابتلا نہیں عذاب ہے، آزمائش نہیں سزا ہے۔ ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک شخص اگر ناکردہ گناہ چوری کے الزام میں پکڑ لیا جائے یا کسی حق بات کو مجاہدانہ اعلان کرنے کی پاداش میں قید خانہ میں بند کر دیا جائے تو یہ ابتلا ہے اور اگر اس کے برعکس چوری کرتا ہوا گرفتار ہو جائے اور قید میں ڈال دیا جائے تو یہ عذاب کہلائے گا۔ قرآن مجید میں بنی اسرائیل کا جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اس سے یک جائی طور پر ابتلا اور عذاب دونوں کا فرق بین طور پر معلوم ہوتا ہے اور ساتھ ہی یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ابتلا کی صورت میں قرآن صبر، توکل اور تسلیم و رضا کا مطالبہ کرتا ہے اور عذاب کی صورت میں توبہ، اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور انابت الی اللہ کا۔

چنانچہ غور کرو کہ جب فرعون اور ہامان نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ربوبیتِ حق کے متعلق گفتگو میں شکست کھائی اور اس نے بنو اسرائیل کے متعلق ان کو ہر قسم کی ایذا رسانی کا فیصلہ کر لیا تو چونکہ بنی اسرائیل کا ان مصائب اور شدائد میں گرفتار ہو جانا محض حضرت موسیٰؑ کی پیروی اور کلمۂ حق کی پذیرائی کی وجہ سے تھا اور اس بنا پر یہ عذاب نہیں بلکہ ابتلا تھا اس لئے حضرت موسیٰؑ نے ان لوگوں کو صبر کی اور اللہ سے مدد مانگنے کی ہدایت کی۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۷/۱۲۸)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اللہ سے مدد مانگو اور صبر سے کام لو۔ بلاشبہ زمین اللہ کی ملک ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام بہرحال پرہیزگاروں کا ہی اچھا ہوتا ہے۔

لیکن جب انہیں لوگوں کی سرکشی، نافرمانی اور احکامِ خداوندی سے بے پروائی حد سے متجاوز ہو گئی یہاں تک کہ وہ گوسالہ پرستی بھی کرنے لگے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۔

بے شبہ وہ لوگ جنہوں نے بچھڑے کو (اپنی پوجا کے لئے) اختیار کر لیا ان پر اللہ کا غضب

عنقریب پہنچے گا اور وہ دنیوی زندگی میں ذلیل بھی ہوں گے اور ہم افترا پردازی باندھنے والوں کو اسی طرح ان کے عمل کا بدلہ دیتے ہیں۔

اب محترم رضوی صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:۔

بین الاقوامی انسانیت کی وسیع ترین بنیادوں میں اپنے ذریعۂ علم و رہنمائی، اپنے تمدنی سانچے اور اخلاقی ٹریننگ دے سکنے والے مذہبی رسوم و ظواہر کو، ہر دوسری پارٹی سے برتر ہونے کا چیلنج دینے والی مسلم پارٹی، اگر کرۂ ارض کے ہر گوشہ پر صدیوں سے وا ماندۂ حیات ہوتی چلی جا رہی ہو، اور جس تاریخی زمانہ میں غلبہ نصیب ہوا تھا اسے بھی ہم باطل اور تاریک زمانہ کہنے سے گریز نہ کرتے ہوں، تو کیا ہر سوچنے والے دماغ کے سامنے یہ سوال نہیں آئے گا کہ مسلم پارٹی کو محفوظ ترین قرآن کا ذریعۂ علم و رہنمائی کیوں روشنی نہ دے سکا؟ کیوں ہر جغرافیائی ملک میں نئے سے نئے تمدنی سانچے بنتے اور بگڑتے چلے گئے اور مذہبی رسوم و ظواہر کی پابندیاں کیوں اخلاقی معیار کو بلند سے بلند تر کرتے رہنے میں ناکام رہیں؟ گویا کہ پیغمبرانہ انقلاب کی آخری قسط اور الہام ربانی کے اس سمندرِ علم و حکمت سے جو تیرہ پاروں کے کوزہ میں بند تھا، بین الاقوامی انسانیت تو رہی ایک طرف خود مسلم پارٹی کو بھی کچھ نہ مل سکا؟ انسانی شعور و تجربہ ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے زندگی کا ایک معین تصور طے کرنے، علمی نتائج پیدا کرنے، کائناتی طاقتوں کو مسخر کرنے یہاں تک کہ وہ مستقبل کو بھی کسی نہ کسی حد تک معین کرنے کے قابل ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن وہ مذہب جس کی وسعت و ہمہ گیری کے سامنے زمین و آسمان بھی تنگ محسوس ہونے لگے تھے، محدود سے محدود تر ہوتے ہوئے پرائیویٹ زندگی سے بھی تنگ تر فضاؤں کی تلاش کیوں کر رہا ہے؟ کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ اس کے پاس اس اخلاقی وعظ، اور ان سادہ تعلیمات کے سوا کچھ نہ تھا، جو اس زمانہ کی سادہ تمدنی زندگی ہی کے لئے موزوں ہو سکتے تھے اور جنہیں ہر مذہب بلکہ ہر تمدن انسانی بغیر وحی و الہام سے فائدہ اٹھائے ہوئے بھی جانتا تھا؟ اگر اس کے پاس اس کے علاوہ اور بلند بھی کچھ تھا تو اسے کیوں پیش نہیں کیا جاتا تاکہ حیاتِ انسانی کو وہ شرف و مجد حاصل ہو جائے جو اس کی فطرت کا منتہیٰ ہے۔ اور نہیں تھا تو کیوں اعترافِ شکست نہیں کر لیا جاتا تاکہ زندگی کی بے تاب تمنائیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے اور کوئی راستہ تلاش کریں؟ یہ تھا وہ سوال جسے طلوعِ اسلام کے صفحات پر اٹھایا گیا تاکہ مسلم مفکرین کسی فیصلہ تک پہنچ سکیں۔ لیکن ایک ہندوستانی معاصر نے اس سوال پر بہت زیادہ برہمی کا اظہار فرمایا ہے اس کے نزدیک یہ سوال اٹھانا ہی "تعجب انگیز، افسوسناک بلکہ شرمناک حرکت" ہے۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ ایسے سنجیدہ، علمی اور مذہبی سوال کو اٹھانا کیونکر گناہ ہو گیا۔ ہندوستانی معاصر نے جس ذہنی پس منظر میں اپنے "نظرات" مرتب فرمائے ہیں جب تک آپ اسے نہ سمجھ لیں اس کے ان شکن ہائے جبیں کی علت اور غایت سمجھ میں نہیں آسکے گی۔

ہمارے وہ کرم فرما جنھوں نے اس سوال ہی کو شرمناک قرار دیا ہے قوم پرست پارٹی کے ایک مذہبی رکن تھے، اور پاکستان کو "خوابِ بے تعبیر" یقین کرنے والوں میں سے۔ مگر پاکستان ایک ٹھوس واقعہ کی حیثیت سے سامنے آگیا، قوم پرست پارٹی شکست خوردہ ہو کر پیچھے چلی گئی، اچانک اور غیر متوقع انقلاب ہمیشہ دل و دماغ کو بیکار بناتا رہا ہے۔ اس پارٹی کا بھی یہی حال ہوا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب انھیں ہر مصیبت کا سبب پاکستان ہی نظر آتا ہے۔ مسلمان کیوں خراب و خستہ ہیں، کیوں مفلس ہیں، کیوں بین الاقوامی طاقت نہیں، کیوں تعلیم فتہ نہیں؟ ان سب کا ایک ہی جواب ہے "چونکہ مسلمانوں نے مولویوں کا کہنا نہ مانا تھا اور ان کی پیہم مخالفت کے باوجود پاکستان بنا لیا، اسلئے یہ ساری مصیبت ہے" اور اتنی سی بات سمجھنے کے لئے ان کے نزدیک کسی بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی سوال اٹھایا جائے تو لازمی طور پر تعجب انگیز ہوگا۔

یہی وہ تعجب ہے جو محترم معاصر کو محسوس ہوا۔ لیکن اس چیز کا اعتراف کرنا چاہئے کہ جو کچھ کہا گیا وہ شعریت آمیز کنایہ کے ساتھ۔ ورنہ اگر براہِ راست ہی نشانہ پر لے لیتے تو کون ہاتھ پکڑتا۔

کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے اقتدار کی تاریخ کو دہرانے کے لئے مسلم پارٹی کو خون و آتش کے سیلاب سے گذرنا پڑا۔ جیسے کہ ہندو قوم کو بھی وسیع ترین اقتدار کے شوق نے نسبتاً کم سہی مگر تباہی مول لے لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر طلوعِ اسلام کا سوال ہندوستانی سیاست کے دائرہ میں بند نہیں یہ سوال اسلامی دنیا، مسلم قوم اور ساری دنیا کی مسلم پارٹی سے وابستہ ہے، نہ کہ ان مہاجرین سے جنھوں نے اپنا سب کچھ مسلم اقتدار کے لئے لٹا دیا۔ صدیوں سے ہر اسلامی ملک میں پاکستان ہی نہیں بنتا رہا، جسے مصائب کا اصلی سبب قرار دیا جا سکے۔ بلکہ اس کی کوئی اور وجہ ہوگی جس تک ہمارے مفکرین نہیں پہنچ سکے۔ قوم پرست معاصر کا فرض ہے کہ سیاسی شکست کی ناگواریوں سے بالاتر ہو کر اس بنیادی سبب کی تلاش کرے جو مذہب پرست مسلمانوں کو بھی باعزت زندگی تک نہیں پہنچنے دے رہا۔

ہندوستانی معاصر نے سوال کو تعجب انگیز ثابت کرنے کے بعد افسوسناک اور شرمناک ثابت کرنے کے لئے جس طرزِ فکر سے کام لیا ہے وہ شاید اس سوال سے زیادہ افسوسناک ہے جسے معاصر کے

نازک جذبات برداشت نہیں کر سکے۔ ان کا خیال ہے کہ احکامِ خداوندی کی تعمیل نہ کرنے کی وجہ سے مشکلات میں مبتلا ہونا پڑتا رہا۔ بات اپنی جگہ درست ہے مگر جب تک اس گتھی کو نہ سلجھایا جائے گول مول باتوں سے مسلم عوام کسی آخری فیصلہ تک نہ پہنچ سکیں گے۔ آخر احکامِ خداوندی پر عمل نہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ کہ چونکہ نماز، روزہ کی پابندی کرنے اور "زہد و تقویٰ" کی زندگی بسر کرنے والے کم ہیں اس لئے ہم تباہ حال ہو گئے۔ اگر یہی بات ہے تو خلافتِ بنو امیہ، خلافت عباسیہ اور خلافتِ عثمانیہ وغیرہ میں کب صحابہ کرامؓ جیسی سوسائٹی پائی گئی تھی کہ انھیں غلبہ و اقتدار بھی نصیب ہوا اور امن و عیش بھی۔ مسلمانوں ہی پر کیا موقوف ہے کیا دوسرے اہلِ مذاہب بلکہ خدا دشمن پارٹیوں کو وہ کچھ نہیں ملا جو مسلم پارٹی کو ملا تھا؟ آخر قوموں کو عزت و ذلت دینے کی بنیاد قانونِ قدرت کے نزدیک کیا ہے؟ قرآن نے اس پر کچھ روشنی ڈالی تھی یا نہیں؟ کیا قرآن کا فیصلہ تاریخی تجربات سے ثابت ہو چکا ہے یا نہیں! فیصلہ کیا تھا اور تجربہ کیا ہے؟ دونوں پر واضح انداز میں بحث و گفتگو کرنا چاہیے۔ قرآن نے کہا تھا۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ

اپنی ٹھوس تاریخی مشیت کے مطابق، خدا قوموں کو عزت و ذلت سپرد کرتا، اقتدار دیتا اور چھینتا ہے۔ زندگی کے بہتر پہلو خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔

گویا عزت و ذلت، اقتدار سپرد کرنا اور اقتدار چھین لینا، ایک بنیادی مقصد رکھتا ہے، زندگی کے بہترین پہلوؤں کو نشوونما کی سہولتیں دیتا ہے۔

اگر قرآن کا فیصلہ یہی تھا اور "صاحبِ نظرات" اس پر یقین رکھتے ہیں تو کیا ہمارا معاصر جرأت سے کام لے کر کہہ سکتا ہے کہ زندگی کے پلٹے چونکہ قدرت ہی کے اختیار میں ہیں جو کبھی ظالم نہیں ہو سکتی، اس لئے اس نے قائداعظم کو پاکستانی اقتدار کا تاج پہنا کر اور قوم پرست پارٹی کی تیس سالہ جدوجہد کو ناکام بنا کر زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کو آگے بڑھنے کا موقعہ دیدیا۔ عوامی شکایات اور مصائب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہدینا تو آسان ہے کہ اگر پاکستان نہ بنایا جاتا تو ہندو قوم اپنی تاریخی دشمنی، تنگ دلی، تنگ نظری کے باوجود مسلمانوں کے لئے ترقی کا ہر دروازہ کھول دیتی۔ (حالانکہ وہ سکھ اقلیت کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ نہیں کر رہی)۔ لیکن اس سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ جس قانونِ قدرت کے قبضے میں زندگی کے سارے پلٹے ہیں اس نے علماءِ کرام کے تقویٰ، تہجد گذاریوں اور قربانیوں کو کیوں ٹھکرایا اور قائداعظم کو اتنی عظمت و برتری کیوں سپرد کی جس کی نظیر صدیوں کی مسافت طے کرنے پر بھی دستیاب نہ ہو سکے گی؟ اگر کائنات کے تاریخی نظام کو ایک بیدار، طاقتور، باشعور اور بااختیار خدا ہی چلا رہا ہے تو آپ کیوں نہیں سوچتے کہ "مولویانہ آرزوؤں" کے خلاف جو کچھ

سامنے آرہا ہے اس کی بنیاد کیا تھی؟ کیا ہم نے نئے تاریخی سلسلے کے بارے میں قرآنی فکر کا اندازہ ہی نہیں کیا؟ یا جو کچھ قرآن نے بتایا اسے زندگی کے ٹھوس قوانین اور زندہ کارفرمائیوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں؟ کیا قرآن راستہ کے ان پیچ و خم، گزرگاہوں اور مشکلات سے باخبر ہی نہیں جس سے مفاد پرست انسانیت کو گزرنا پڑے گا؟ کیا قرآن مفاد پرستانہ رجحانات رکھنے والی انسانیت کو امن و عیش سپرد کر سکنے کی تدبیر نہیں جانتا؟ کیا اس کا ہمہ گیر علمِ زندگی کے صدہا پیچ در پیچ راستوں میں سے صرف ایک راستہ تک محدود ہو کر رہ گیا؟ اور کیا اس راہ سے منزل تک پہنچنے میں جن رکاوٹوں سے دوچار ہونا ہے، بعض کی وجہ کی جن الجھنوں کا حل تلاش کرتا ہے، قرآن بہت سے حالات میں انہیں دور کر سکنے کی کوئی ایسی تدبیر نہیں بتا سکتا جو انسانی شعور و تجربہ کی گرفت میں آسکتی ہو؟ اگر جواب نفی میں ہے تو قرآن کی ساری عظمت صرف اخلاقی قدروں کے دائرہ میں سمٹ کر رہ جائے گی اور اگر جواب اثبات میں ہے تو اسے پوری تفصیلات کے ساتھ علم بارڈ کے سامنے رکھنا چاہیے۔ ہمارے محترم پرویز صاحب کا دعویٰ ہے کہ قرآن گوناگوں رہنمائیوں سے محروم نہیں رہا، انہوں نے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے وہ معارف القرآن میں سچائیوں کے صدہا موتی بکھیر چکے۔ مگر کیا معترضین بتا سکیں گے کہ آج تک تعلیم یافتہ نوجوانوں کے . . . .

دل و دماغ پر قرآن کی فکری برتری کا نقش بٹھانے کے لئے انہوں نے کونسا قابلِ ذکر اقدام کیا تھا؟ اور کیا کوئی بھی جدوجہد کرنے کے باوجود انہیں یہ حق بھی دیا جا سکتا ہے کہ وقت کے اہم سوال کو چھیڑنے پر افسوس و تعجب کا مظاہرہ کر سکیں؟ یہ سوال آج ہی اہم نہیں صدیوں سے اہم ترین بن چکا ہے۔ مگر چونکہ سیاسی زوال کے آغوش میں دماغی انحطاط بھی پرورش پاتا رہا اس لئے پوری پوری اہمیت کا احساس نہ ہو سکا۔ آج زندگی کے نئے تقاضوں، مسلم اقتدار کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور تمدنی علوم کی وسعتوں نے ہمیں جس مقام پر کھڑا کر دیا ہے وہ پچھلی الجھنوں خوردگی کی کیفیت کو باقی نہیں رہنے دے سکتا۔ تاریک فضاؤں میں بلند ترین پہاڑ بھی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں لیکن صبح کی تابانیوں میں کوئی ذرہ بھی اپنے وجود و ہستی کو نگاہوں کی زد سے نہیں بچا سکتا۔ ہندوستان میں ابھی تک فضا تاریک تھی وہاں زندگی کے نئے مسائل سے آشنا ہو سکنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ اس لئے اگر ہمارا معاصر تعجب کا اظہار کرے تو اسے ایک حد تک معاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس نئے ملک کے زندہ نوجوانوں کو آپ وقت کے نئے تقاضوں سے ناآشنا نہیں رکھ سکتے جسے قدرت نے پیدا ہی اس غرض سے کیا ہے کہ اسلام کی فکری اور عملی صلاحیتوں کو نمایاں کرے۔ اگر پاکستان میں مذہبی جذبات سے کھیلتے رہنے اور مذہب کو تعلیمِ آخرت ہی بنائے رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی تو ردِ عمل کا قانون ہمارے

نوجوان طبقہ کو ان پارٹیوں کی گود میں پھینک دے گا جو اُسے جاندار، مستقبل بدوش اور بیدار بنا سکتی ہوں گی۔

ہمیں یہ طے کرنا ہی پڑے گا کہ اگر قدرت ظالم نہیں تو اس نے کرۂ ارض کو ظلم کی نمائش گاہ کیوں بنا رکھا ہے؟ معاشی تاریخ کے پلٹے، مشرقی اور مغربی اقتداروں کی تبدیلیاں اور مسلم پارٹی کا زوال و عروج، قانونِ زندگی کی کونسی دفعہ کے مطابق ہو رہا ہے اور قرآن نے ان گوناگوں تبدیلیوں کے بارے میں، اپنے بالاتر ذرائع علم سے ہمیں کچھ دیا تھا، یا ہم یونہی گروہ بندانہ جذبات کے طوفان میں خواہ مخواہ اپنے الہامی ذریعۂ علم، اپنے تصورِ زندگی اور اپنے دینِ مکمل کو دوسرے مذاہب اور اقوام و ملل سے بہتر کہتے چلے جا رہے ہیں؟

اگر ہمارے معاصر کے نزدیک مسلمانوں کی مشکلات بداعمالیوں کے نتیجہ میں ہیں تو مغربی اقوام کی خوش حالی، اقتدار و غلبہ اور عیش و لذت کی زندگی کون سی نیک اعمالیوں کا نتیجہ ہے؟ کیا یورپ کے عیسائی اور ہندوستان کے ہندو مسلمانوں سے زیادہ نمازی اور روزہ دار تھے؟ کیا "حضورِ قلب" کی نعمت انہیں نصیب ہو گئی؟ یا قوموں کا عروج و زوال، مذہبی مراسم، گروہ بندانہ نعروں اور بے جان عقائد سے وابستہ نہیں بلکہ اس کے لئے کسی دوسری ہی چیز کی ضرورت ہے؟ اگر دوسری چیز کی ضرورت ہے تو قرآنی آیات سے اس پہلو کا ہر جزء متعین کیجئے، ورنہ قرآن کا وہ نظریۂ حیات بتائیے جسے تاریخی شہادتوں سے آپ ثابت کر سکتے ہوں۔

اگر بے میل علمی ذہن و مزاج کے سایہ میں چیلنج دینے کو ہمارا محترم معاصر گوارہ کر سکتا ہو تو میں چیلنج دیسکتا ہوں کہ علماء کرام کے سوچ بچار کا وہ انداز جسے پچھلی صدیوں نے فرسودہ بنا دیا "وقت کے اہم سوال" کا جواب نہیں دے سکتا۔ جن حضرات نے قرآن کو جامد رسوم و آئین کا مجموعہ ہی سمجھا ہو وہ زندگی کے ان نازک پہلوؤں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے جو ہمیشہ نئے سے نئے لباس میں آتے رہتے ہیں۔ زندگی اٹل قوانین ہی سے لبریز نہیں بلکہ ملتے جلتے اور بدلتے رہنے والی نیرنگیوں سے بھی معمور ہے۔ تصویرِ زندگی کے یہ دونوں رخ ہمیشہ پہلو بہ پہلو سامنے آتے رہتے ہیں اور ہمیشہ آتے رہیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن نے اپنے آپ کو "کتاب محکمات" کہنے کے ساتھ ہی

كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ

ملتا جلتا اور تہہ بر تہہ دستور

بھی بتایا تھا۔ چونکہ خارجی زندگی کا علمی مطالعہ کرنے کی کبھی زحمت نہ گوارہ کی گئی اس لئے یہ بات سمجھ میں ہی نہ آسکی کہ قرآن کیونکر "کتابِ متشابہ" ہو گیا۔ آپ ہزاروں مفسرین میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دکھا سکتے۔

جس نے قرآن کا وہ حسین ترین پہلو دکھانے کی جرأت کی ہو جس نے کتابِ محکم سے مل کر قرآن کو زندگی کا مکمل قانون بنا دیا تھا۔ قرآن نے صاف الفاظ میں اعلان کیا تھا۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ[1]

خدا نے حسین ترین بات انسانیت کو سپرد کی۔

قرآن کا چسن کونسا حُسن تھا؟ متشابہات والی کتاب ہو جانے کا حسن۔ مگر ہم اپنی بدنصیبی سے ہمیشہ اس حُسن کو بے نقاب دیکھنے سے گریز کرتے رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں ہم قرآن کی رہنمائی سے اپنے آپ کو محروم ہو جانے والا یقین کئے ہوئے ہیں۔ جب تک فرسودہ طرزِ فکر میں انقلاب نہ پیدا کیا جائے گا ہر سوال وقت کا اہم سوال بنتا رہے گا، اور کسی مولوی صاحب کی طعنہ بازی اسے روک نہ سکے گی۔

ہمارے معاصر نے ایک آیت کے ذریعہ مسلمانوں کو بتایا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ کی نصیحت نہ ماننے سے فرعون غرق ہوا ایسے ہی پیغمبرِ اسلام کی اطاعت نہ کرنے کی بنا پر (پاکستانی) مسلمانوں کا بیڑا غرق ہوا۔ کاش ہمارے معاصر کو یہ سمجھنے کی توفیق ہوتی کہ فرعون اس لئے غرق ہوا تھا کہ کبریائی کے جواب میں اپنی کبریائی کی نمائش کرنا چاہتا تھا۔ اور (پاکستانی) مسلمانوں پر اس لئے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے کہ انھوں نے بت پرستوں کے اقتدار سے نکل کر اس پارٹی کا جھنڈا لہرانا چاہا جو پیغامِ الٰہی کی نگہبان تھی، جو ایک خدا کے سامنے اپنا سر جھکا رہی تھی اور جو اسلامی قانون ہی کو اپنی سوسائٹی میں نافذ کرنا چاہتی ہے خواہ کامیابی ہو یا مذہبی رہنماؤں کی غلط کاریاں رکاوٹ بن جائیں۔

فرعون اور مسلم پارٹی کو ایک ترازو میں تولنا آپ ہی کی جرأت ہے ورنہ ہم جیسے گنہگار تو اتنی ہمت نہ کر سکتے۔

ہمارا محترم معاصر ایک جدید ترین علمی تحقیق سپردِ قلم کرتے ہوئے "ابتلا اور عذاب" میں فرق ثابت کرنا چاہتا ہے اور صرف اس لئے کہ ہم گنہگاروں کے کاندھے زیادہ بوجھل کئے جائیں۔ ورنہ شاید نجات کی کوئی صورت نکل آتی۔ حالانکہ یہ فرق نہ عربی لغت سے ثابت کیا جا سکتا ہے، نہ قرآنی اصطلاح سے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نازک علمی فرق کیونکر پیدا کر لیا گیا۔ "ابتلاء" کے معنی "پلٹنے" کے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے جہاں بچہ کی پیدائش کے تخلیقی انقلابات کا ذکر کیا ہے وہاں اس نے اسی لغت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور حضرت شیخ الہندؒ نے

---

[1] نئی بحث سے بچنے کیلئے حدیث کا سادہ ترجمہ کر دیا گیا ہے ورنہ قرآن حدیث کے بارے میں ایک مخصوص تصور رکھتا ہے۔ (ابو النظر رضوی)

بھی اسی مقام پر وہی توجہ کیا ہے جسے میں عرض کر چکا ہوں مختلف نئے نئے رنگ، پہلو اور پہلو یہ ہے ابتلا کے لغوی معنی کی سپرٹ۔ یہ ابتلا کبھی خوشگوار ہوتا ہے کبھی ناخوشگوار۔ خوشگوار کو قرآن بلاءً حسنًا (خوشگوار ابتلاء) کہتا ہے۔ ناخوشگوار کے لئے "سیئہ" لگا دیجئے۔ نئی تبدیلی چاہے خوشگوار ہو یا ناخوشگوار ہمیشہ سماجی زندگی کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی عذاب بھی اجتماعی کردار کا ردِ عمل ہوتا ہے، خواہ کائناتی ردِ عمل ہو یا تاریخی ردِ عمل۔ یہ کہنا کہ ان دونوں میں سے ایک اختیاری ہے اور ایک غیر اختیاری علم و منطق کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔ پھر یہ کہنا کہ ابتلاء اچانک ہوتا ہے اور عذاب اچانک نہیں ہوتا قطعاً درست نہیں۔ عذاب تو ہمیشہ

بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔

اچانک اور اس طرح پر کہ کسی کو اندازہ نہ ہو سکے۔

یہ تو انتہائی حیرت ہے کہ علمی ادارہ کی طرف سے ایسی چیزیں پیش کی جائیں جن میں کوئی بھی سنجیدگی نہ ہو! اور کچھ لطف یہ کہ اپنے تصور کی تائید میں ایک آیت بھی پیش کی گئی ہے۔ حالانکہ اس کے آگے پیچھے کہیں بھی ابتلاء کی اصطلاح نہیں استعمال کی گئی۔ اگر ابتلاء سے ہمارے معاصر کا مدعا وہ ابتدائی مشکلات ہیں جو کسی پروگرام کو کامیاب بنانے اور غلبہ و اقتدار کی بلندیوں تک پہنچنے کے وقفہ میں برداشت کرنا پڑتی ہیں، جیسے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم یا رسول کریمؐ کے صحابہ کرامؓ کو برداشت کرنا پڑیں تو پھر یہ کہنا کہ

"ابتلاء میں انسان کو واقعہ کے اسباب و علل پر اختیار نہیں ہوتا، جو کچھ ہوتا ہے اچانک ہوتا ہے اور بالکل غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے۔"

اتنی غلط انداز سے پیش کیا گیا کہ اس سے زیادہ غلط کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر حضرت موسیٰؑ کے ساتھی ان سے الگ ہو جاتے تو انہیں نئی مشکلات سے ہرگز دوچار نہ ہونا پڑتا۔ علاوہ ازیں جب سے جماعتی تصور رکھنے والی قوموں نے کسی تمدنی زندگی کو اپنے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا ہے، آج تک مشکلات کا طوفان اچانک نہیں آیا۔ ان مشکلات کی موجیں ہمیشہ آہستہ خرام رہیں۔ کوئی شک نہیں کہ ایسی جد و جہد میں بڑے کٹھن لمحات بھی آ سکتے ہیں اور سخت ترین مشکلات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ مگر وہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح اچانک آبادیوں کو اپنے آغوش میں نہیں لے سکتیں۔ اگر ہمارے اہلِ قلم اپنی علمی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے لگیں تو مجھے یقین ہے کہ مسلم قوم کی موجودہ ذہنی الجھنوں، جذباتی بحرانوں اور معاشرتی پیچیدگیوں کو بہت حد تک دور کیا جا سکے گا۔ قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والے اگر قرآن کا مطالعہ بھی کرنے لگیں تو وقت کے لرزہ خیز سوالات بھی صحیح مشائخ کی ایک ہی گردش میں حل کئے جا سکیں گے۔

ایک دوسری آیت بھی نقل کی گئی ہے۔

سینالھم غضب من ربھم وذلۃ فی الحیٰوۃ الدنیا وکذٰلک نجزی المفترین

بہت جلد منکرین کو معاشی نشوونما دینے والے کی طرف سے سخت ناگواری اور معاشی زندگی میں ذلت وخواری سے دوچار ہونا پڑے گا۔ خدا کی طرف بیجا قوانین منسوب کرنے والوں کا ہمیشہ یہی نتیجہ ہوتا رہا۔

کیا ہمارا معاصر اس آیت کو سامنے رکھ کر قوم پرست پارٹی اور لیگ پارٹی کو خدا کی میزان میں تولنے کے لئے تیار ہے؟ معاشی زندگی کی پس ماندگی، قانونِ قدرت نے کس پارٹی کو دی اور خدا کی ربوبیت و پروردگاری سے پیدا ہونے والے وسائل پر کون سی پارٹی کو اقتدار دیا؟ ابتلا اور عذاب پر بحث کرنے والے کیا بتا سکیں گے کہ تقسیم شدہ زندگی میں تصویر کے ان دونوں پہلوؤں میں سے کونسا ابتلاء ہے اور کونسا عذاب؟ اگر دونوں عذاب ہوں تو ایک پہلو معاشی اقتدار لئے ہوئے اور دوسرا پہلو معاشی زندگی کی غلامی لئے ہوئے کیوں ہے؟

بدقسمتی سے آج تک حق و باطل کی اس جنگ پر علمی نقطۂ نظر سے غور ہی نہیں کیا گیا۔ جو کارخانۂ ہستی کے ہر گوشہ میں جاری ہے اور جس کے نتائج ہمیشہ حق کی فتح و کامرانی ہی کی شکل میں نکلتے رہے۔ ہر گروہ اپنے آپ کو حق پرست، نجات یافتہ قرار دیتا ہے مگر نہ حق کا تصور طے کر سکتا ہے نہ اپنی نجات یا فتح کا وہ عکس دیکھ سکنے کے قابل، جس میں ٹھوکروں، رسوائیوں اور فاقہ پرستیوں کے سوا کوئی رنگ بھی ابھرا ہوا نہیں ہے۔ کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ اگر وقت کے اہم سوالات پر سنجیدگی سے بحث و گفتگو کرنے کا سلیقہ نہ ہو تو کم از کم آئندہ غیر ذمہ دارانہ باتیں کرنے سے ہی گریز کیا جائے۔

آخر میں اگر ایک ادبی غلطی کا اظہار کر دیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ ہمارے معاصر نے "وما کانوا سابقین" کی ضمیر، استکبار کرنے والوں کی طرف راجع کی ہے۔ حالانکہ اگر اس ترجمہ کو تسلیم کر لیا جائے تو "فکلا اخذنا" سے ربط نہ دیا جا سکے گا۔ قرآن کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ ایسے متکبر پچھلی قوموں میں بھی ہوتے رہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مگر تمام اقتدار پرستوں کو تباہی سے گذرنا پڑا۔ تمہارا بھی یہی حال ہوگا۔ امید ہے کہ مولانا نے محترم "وما کانوا سابقین" کو ایک مستقل فقرہ قرار دینا پسند کریں گے تاکہ بے ربطی نہ پیدا ہو سکے۔

اسبابِ زوالِ امت کی عمومی اور عقلی تعبیر

(حکیم حیدر زماں صاحب صدیقی۔ ہری پور۔ ہزارہ)

اسبابِ زوالِ امت کی تشخیص کے سلسلہ میں جن اسباب کا بار بار اعادہ کیا جاتا رہا ہے ان کی صحت سے انکار نہیں ہے لیکن ان کی تعبیر محدود زاویۂ فکر کی پیداوار ہے اور اس مسئلہ پر وسیع تر انسانی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ مسلمانوں کا جب یہ دعویٰ ہے کہ قرآنی تصورِ زندگی ہمہ گیر اور عالمی حیثیت رکھتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمہ گیر قرآنی تصورات کی روشنی میں اس مسئلہ کا تحقیقی جائزہ نہ لیا جائے۔

سب سے پہلے ایک بنیادی مسئلہ کی تنقیح ضروری ہے کہ عروج و زوال کے بنیادی اسباب و عوامل تمام اقوام و ملل کے لئے یکساں ہیں یا ہر قوم کے اسباب عروج و زوال جدا جدا ہیں۔ دوسری صورت بعید از عقل ہے کہ ہر قوم کے لئے الگ الگ فطری قوانین ہوں بلکہ حکمتِ قرآنی بھی اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ قرآن حکیم سے مفہوم ہوتا ہے کہ کائنات انسانی کا نظام جن اٹل اور محکم قوانینِ فطرت پر مبنی ہے وہ قوانین ہر قوم و ملک کے لئے الگ الگ نہیں ہیں۔ فطرت اللہ ایک ہی ہے اور وہ تمام انسانوں کو یکساں طور پر مخاطب کرتی ہے۔

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (آیہ)

یہ وہی فطری دین ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا۔ خدا کی پیدائش میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی وہ دینِ محکم ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اور

سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (آیہ)

یہ خدائی قانون ہے جو گذشتہ اقوام میں جاری و ساری رہا ہے اور تم خدائی قانون میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

دراصل پوری انسانی تاریخ اسی "فطرت اللہ" اور "سنۃ اللہ" کی عملی تعبیر و تفسیر ہے اور اقوامِ دنیا کا عروج و زوال ہمیشہ اسی سے وابستہ رہا ہے۔

فطرت اللہ کا منشا یہ ہے کہ دنیا کے انسانوں میں تحزب و افتراق نہ ہو۔ سب کا ایک ہی مقصودِ حیات ہو جس کی جانب وہ بے تابانہ حرکت کریں اور ان کے عقیدہ و مسلک میں کسی طرح کا اختلاف و تضاد نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم جب انسانیت کے مشترکہ نصب العین کا ذکر کرتا ہے تو بلا تخصیص تمام انسانوں کو "الناس" کے عام لفظ سے مخاطب کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں اس مفہوم کی بہت سے آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش میں تمام انسان "امت واحدہ" تھے اور ان کا ایک ہی دستورِ حیات تھا مگر مفاداتِ جزئیہ اور اغراضِ عاجلہ نے ان کو غلط راستہ پر ڈال دیا اور وہ کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

وما کان الناس الا امۃ واحدۃ فاختلفوا ولولا کلمۃ سبقت من ربك لقضی بینھم فیما کانوا فیہ یختلفون (آیہ)

شروع میں تمام انسان ایک ہی امت تھے پس انھوں نے اختلاف کیا۔ اگر پہلے سے یہ بات طے شدہ نہ ہوتی (کہ دینِ خداوندی کے قبول اور عدم قبول کو خود انسان پر ہی چھوڑ دیا جائے) تو ان کے اختلاف کا آخری فیصلہ کر دیا جاتا۔

یہ اختلاف چونکہ فطرت اللہ کے منشاء کے خلاف تھا اس لئے خدائے قدوس نے ارسالِ رسل اور انزالِ کتب کا سلسلہ جاری کیا۔

کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ (البقرہ)

لوگ ایک ہی امت تھے (انھوں نے باہم اختلاف کیا) تو اللہ تعالیٰ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء کو بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اختلافی باتوں کا فیصلہ کریں۔

وحدتِ انسانی کے ہمہ گیر قرآنی تصور کے پیشِ نظر یہ دعویٰ یقیناً حق بجانب ہے کہ انسانیتِ عامہ کی فلاح چند عالمگیر اور محیط کل قوانینِ فطرت سے وابستہ ہے۔ جو اقوام ان قوانین کا احترام کرتی ہیں وہ بہرحال عزت و وقار کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتی ہیں اور جو قومیں ان قوانین کی توہین کرتی ہیں دنیا کی ذلت و رسوائی ان کے حصہ میں آتی ہے اور اس میں رنگ و نسل، نام اور مرز و بوم کا کوئی لحاظ نہیں ہے، کیونکہ یہ قوانینِ فطرت وہ محکم اور غیر متزلزل حقائق ہیں جن پر زمان و مکان کا اختلاف اثر انداز نہیں ہوتا اور ہر لمحہ انسانی زندگی ان سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔

لہ ہمارے نزدیک یہ مفہوم صحیح نہیں۔ اس پر تفصیلی گفتگو کسی فرصت کے وقت ہوگی۔ (طلوعِ اسلام)

اس سے انکار نہیں ہے کہ ہر قوم و ملت کے جداگانہ وجود کے بقا کے لئے کچھ مخصوص عوامل ہوتے ہیں جو محض اس قوم کے خصوصی تشخص پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن علم انسانی قوانین کی نظر میں تمام قومیں یکساں ہیں۔

قوانینِ فطرت کا تجزیہ

انسانی زندگی دو بڑے شعبوں میں منقسم ہے۔ داخلی اور خارجی یا روحانی اور مادی۔ اول الذکر شعبہ اخلاقی اور مابعد الطبیعی قوانین سے متعلق ہے اور دوسرے شعبہ میں مادی اور طبیعی قوانین تصرف کرتے ہیں۔ سیاست و معیشت اور معاشرت وغیرہ اسی خارجی شعبہ کے اجزا ہیں۔ جس طرح مذکورہ خارجی اور داخلی شعبوں کے لئے الگ الگ قوانین ہیں اسی طرح خارجی شعبہ کے مختلف اجزا کے لئے بھی جدا جدا قوانین ہیں۔ یہ تمام قوانین اپنے اپنے دائرۂ عمل میں کارفرما رہتے ہیں۔ مگر اس بات سے بھی انکار نہیں ہے کہ جس طرح زندگی کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہیں اسی طرح ان کے قوانین بھی اگرچہ اولاً و بالذات اپنے اپنے دائرۂ عمل میں اثر و نفوذ رکھتے ہیں مگر مآل و نتیجہ کے اعتبار سے ایک شعبۂ زندگی کے قوانین دوسرے شعبوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور بالآخر ایک شعبہ کا فساد پوری زندگی کے فساد پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے کئی ایسی اقوام کا ذکر کیا ہے جن کی زندگی میں معیشت کی راہ سے فساد و اختلال داخل ہوا۔

وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا فتلک مساکنھم لم تسکن من بعدھم الا قلیلا (القصص)

بہت سی قومیں جو اپنی معیشت میں حد اعتدال سے بڑھ گئی تھیں ان کو ہم نے ہلاک کیا۔ پس یہ ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد بہت ہی کم آباد ہوئے ہیں۔

یہ خیال کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں الگ الگ قوانین کارفرما ہیں واقعاتی نقطۂ نظر سے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر دور میں ایسی قومیں ملتی ہیں جو سیاسی اعتبار سے محکوم یا پس ماندہ ہوتی ہیں لیکن معاشی لحاظ سے وہ اقوام عالم کی صف اول میں جگہ پاتی ہیں اور ایسی اقوام بھی ہوتی ہیں جو سیاسی طور پر آزاد اور خود مختار ہونے کے باوجود معاشی لحاظ سے دنیا کی پس ماندہ اقوام میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سیاست، معیشت اور دیگر شعبوں کے لئے الگ الگ قوانین ہیں اور جو قوم کسی ایک ہی شعبۂ زندگی کے قوانین پر زیادہ توجہ دیتی ہے وہ بہر حال اس شعبہ میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتی ہے۔ آج مغربی اقوام اقتدارِ سیاست اور ذرائع معیشت کے لحاظ سے عدیم المثال عظمت و شوکت کی مالک ہیں مگر روحانی فیوض و کمالات اور اخلاقی برتری سے یکسر تہی دامن ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اقوام نے صرف مادی حقائق کے فہم و ادراک اور طبیعی انکشافات ہی کو اپنا مطمع نظر بنا لیا ہے اور اخلاقی اقدار یا مابعد الطبیعی تصورات کو انھوں نے کلی طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔

شرق حق را دید عالم را نہ دید — غرب در عالم خزید از حق رمید (اقبال)

یہی وجہ ہے کہ مادہ وجسم کے انتہائی عروج کے باوجود آج تک عالمِ انسانی زندگی کی اس حقیقی مسرت سے محروم ہے جس کی خواہش ہر انسان کے تحت الشعور میں کارفرما ہے۔

قرآنی تصورِ حیات

قرآنِ حکیم نے انسان کو ایک جامع اور کامل ضابطۂ حیات عطا کیا ہے جو کسی ایک شعبۂ زندگی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ حیاتِ انسانی کے تمام داخلی اور خارجی شعبوں کی رہنمائی کرتا ہے یعنی وہ مکمل قانون کی حیثیت سے نہ صرف مادہ وجسم کی ارتقائی حرکت کی نگرانی کرتا ہے بلکہ تطہیرِ فکر اور تزکیہ نفوس کے ذریعہ انسانی ذہن میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے قرآنی تصورِ زندگی، اور قرآنی ضابطۂ حیات کے ذریعہ حسنِ معاشرہ کی تخلیق ہوتی ہے اس میں مادہ وروح، فکر وعمل، ذکر وفکر، دانش وعشق، سوز ج تمدن اور اخلاق وسیرت کا کچھ ایسا امتزاج ہوتا ہے کہ انسانی زندگی حقیقی طور پر پُرامن، پرسکون اور خوش حال بن جاتی ہے۔ یہی وہ زندگی ہے جس کو قرآن حکیم نے "حیاۃً طیبۃً" اور "عیشۃٍ راضیۃ" (پاکیزہ اور خوشگوار زندگی) کے ناموں سے موسوم کیا ہے، اور اسی سے انسان کو مسرتِ دوام اور عیشِ مسلسل حاصل ہوتی ہے۔ یہ معاشرہ عصرِ حاضر کے ان تمام مہالک وخطرات سے پاک ہے جو اقوامِ حاضرہ کی مادہ پرستی اور عقلیتِ محض کی وجہ سے عالمِ انسانی پر منڈلا رہے ہیں۔

عشق ناپید وخرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

عیشِ دوام اور مسرتِ جاودانی کا حصول اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک کہ حیاتِ انسانی کے تمام حقیقی مطالبات کی تکمیل نہ ہو اور ظاہر ہے کہ حیاتِ انسانی صرف مادہ وجسم کا نام نہیں ہے کہ آج کی اقوام کی طرح صرف اسی کو مرکزِ توجہ بنا لیا جائے بلکہ اس کے علاوہ زندگی کے کچھ دوسرے مطالبات ہیں جن کو محض ظن وتخمین سے حل کرنا ممکن نہیں ہے۔

راہبر ہو ظن وتخمین تو زبوں کارِ حیات

انسانی زندگی تاریخ کے ہر دور میں حکمتِ قرآنی کی محتاج ہے اور قرآن حکیم ہر نئے دور کے لئے اپنے پاس تازہ اور تابناک روشنی رکھتا ہے۔

کہنہ گردد چوں جہاں اندر برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

چنانچہ خود قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کے لئے کامل اور جامع حل پیش کرتا ہے، اور زندگی کا کوئی زاویہ اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہے۔

قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام ویخرجھم من الظلمت الی النور باذنہ ویھدیھم الی صراط مستقیم (المائدہ)

تمہارے پاس خدا کی طرف سے روشنی اور کتاب مبین آچکی ہے۔ جو رضاء الٰہی اور امن کی راہ پر چلنا چاہتا ہے یہ کتاب اس کی رہنمائی کرتی ہے اور ان کو ظلمت و تاریکی سے نکال کر خدا کے حکم سے نور کی طرف لے جاتی ہے اور ان کو سیدھی راہ پر چلاتی ہے۔

عروج و زوال اقوام اور قرآن

ان تصریحات کے پیش نظر علی وجہ البصیرت یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم مجموعۂ قوانین فطرت ہے، اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے مفصل اور جامع دستور پیش کرتا ہے۔ یعنی جہاں اس نے سیاست و معیشت اور معاشرت کے قوانین تفصیل سے بیان کئے ہیں وہاں انسان کے داخلی شعبہ کو اس کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر زیادہ توجہ و التفات کا مستحق قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآنی انقلاب کا مفہوم کسی ایک ہی شعبۂ زندگی کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ پوری انسانی زندگی کی تبدیلی ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نزول قرآن سے پہلے دنیا ان قوانین فطرت سے آشنا نہ تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی پیدائش کے ساتھ ہی انسان کو ان بنیادی قوانین کی تعلیم دی گئی تھی اور تاریخ کے ہر دور میں ان کی تجدید ہوتی رہی ہے۔ انبیاء و رسل نے ہر زمانہ میں ان قدرتی قوانین کے مجموعہ (دین) کے احیاء کے لئے جدوجہد کی ہے اور تاریخ کا کوئی دور اس ضابطۂ حیات کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں سے خالی نہیں رہا۔ ہاں قرآن کریم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اس قانون کو ایک جامع، منضبط اور دوامی شکل عطا کی ہے۔ یعنی قرآنی دستور زندگی، ان ہمہ گیر تصورات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے اور زمان و مکان کی تحدید سے آزاد ہے۔

ان ھو الا ذکر للعالمین ولتعلمن نبأہ بعد حین (آیہ)

قرآن کریم تمام عالموں کیلئے ذکر ہے اور کچھ مدت کے بعد تم اس حقیقت کو ضرور جان لوگے۔

ہم گذشتہ صفحات میں ان قوانین فطرت کی نسبت لکھ آئے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے کچھ جدا جدا قوانین ہیں اور انسانوں کی کوئی جماعت جب کسی ایک ہی شعبۂ زندگی کے قوانین پر عمل کرتی ہے تو وہ بہرحال اس شعبہ میں کمال پیدا کر لیتی ہے اگرچہ یہ کمال دوسرے شعبوں کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے عارضی اور ناپائدار ہوتا ہے اور اس کا انجام یقیناً ہلاکت و بربادی ہے۔ اس اصول کی بنا پر یہ سوال خود بخود ہی حل ہو جاتا ہے کہ آج سیاسی اقتدار اور معاشی برتری کے اعتبار سے غیر مسلم اقوام عروج و اقبال کی بلند چوٹیوں پر کھڑی ہیں۔ اور مسلمان قرآن حکیم کو مانتے ہوئے بھی سیاسی اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اعلیٰ سیاسی اقتدار اور امامتِ اقوام کے لئے جن اصول و قوانین کی ضرورت ہے ایک مدت سے مسلمان ان کو چھوڑ چکا ہے، قومی کردار اور ملی سیرت کی بلندی، آہنی عزم، علوم طبیعیہ کی مہارت، اور ملی شعور وغیرہ وہ امور ہیں جو کسی قوم کو آسمانِ سیاست کی بلندی پر پہنچاتے ہیں اور قرآن حکیم نے ان امور کو متعدد دفعہ بیان کیا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوا اماناتکم (الانفال)

اے ایمان والو تم اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس میں ایک دوسرے کی امانتوں کی خیانت کرو۔

اور

یا ایھا الذین امنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون (آل عمران)

اے ایمان والو صبر کرو اور دوسروں کو صبر کی تلقین کرو اور باہم بندھے جاؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم نجات پاسکو۔

لا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم (الانفال)

آپس میں اختلاف نہ کرو کہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری اندرونی طاقت ضائع ہو جائے گی۔

(وغیر ذالک من الآیات)

اسی طرح کسی قوم کی اقتصادی خوشحالی اور معاشی برتری کے لئے ضروری ہے کہ اس کے افراد میں مخلصانہ تعامل اور ہمدردانہ تعاون موجود ہو اور وہ تقسیم دولت کے فطری قانون پر عمل پیرا ہوں۔ نیز ہر شخص ذاتی اور شخصی خوشحالی سے اجتماعی خوشحالی کے لئے سرگرم عمل ہو۔ قرآن کریم نے ان معاشی اصولوں کو کئی مرتبہ بیان کیا ہے۔ یمحق اللہ الربوٰا ویربی الصدقات (البقرہ)

یعنی سود اور اس قسم کے دوسرے کاروباری معاملات جن سے دولت تقسیم ہونے کے بجائے چند اشخاص میں سمٹ جاتی ہے اس سے بالآخر قوم کی معاشی حالت ناہموار ہو جاتی ہے اور اس سے خطرناک طبقاتی تصادم پیدا ہوتا ہے، اور صدقات یعنی تقسیم دولت کے تمام ذرائع سے مملکت وریاست کی دولت اور خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔

لکیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔ (الحشر)

تاکہ یہ مال دولتمندوں ہی میں نہ چکر کاٹتا رہے۔ (بلکہ دوسروں کو بھی اس کا حصہ ملے)

دراصل سیاست اور معیشت کے ان قوانین میں جو روح کارفرما ہے وہ قومی شعور، ملی احساس اور پرخلوص تعاون ہے۔ یہ روح جس شعبہ زندگی میں زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتی ہے اسی اندازہ سے یہ شعبہ نمایاں حیثیت پیدا کرتا ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر مسلمانوں کا سیاسی اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ہونا یا دوسری اقوام کا (جو کم و بیش ان کے ہمہ گیر اصولِ فطرت کا احترام کرتی ہیں) سربلند ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ترکِ قرآن اور زوالِ اُمت کا سبب ترکِ قرآن ہے اس کی عقلی تعبیر و توجیہ یہی ہے جو سطورِ بالا میں ذکر کی گئی ہے۔ مگر اس بحث سے چند نہایت دقیق اور اہم مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) ملتِ اسلامیہ نے ان اصولِ فطرت کے کس حصہ کو سب سے زیادہ محروم توجہ رکھا اور کس حصہ سے آج تک ان کا لگاؤ رہا ہے۔

(۲) کس کس راستہ سے مسلمانوں کے نظامِ اجتماع اور شیرازۂ ملی میں فساد داخل ہوا؟

(۳) تاریخی اعتبار سے زوالِ امت کا نقطۂ آغاز کیا ہے اور مختلف ادوار میں امت کن کن اسبابِ فساد سے دوچار رہی ہے؟

(۴) ہر تاریخی دور میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لحاظ سے اسبابِ فساد کا کیا توازن رہا ہے؟

(۵) آج ملتِ اسلامیہ اسبابِ زوال کے اعتبار سے کس جگہ پر کھڑی ہے؟

یہ نہایت اہم مسائل ہیں جن پر ہماری تعمیرِ جدید کا انحصار ہے۔ علم و بصیرت رکھنے والے حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ان مسائل پر تحقیقی نگاہ ڈالیں۔

(ہم سمجھتے ہیں کہ اگر محترم صدیقی صاحب اپنے مضمون کو انہی سوالات سے شروع کرتے اور پھر مضمون میں ان کا جواب لکھتے تو ہم "اسبابِ زوالِ امت" کے سمجھنے میں ایک قدم آگے بڑھ سکتے۔ ورنہ اس وقت تک تو ہم وہیں ہیں جہاں سے آغازِ کلام ہوا تھا۔
طلوع اسلام)

باب المراسلات

نکاح نابالغان ایک محترم خاتون، راولپنڈی کے ایک صاحب کے توسط سے دریافت فرماتی ہیں:۔

آج سے تقریباً انیس سال پہلے جبکہ میری عمر تقریباً ایک سال تھی میرے والد ..... نے مسمی ..... نابالغ کے ساتھ جس کی عمر اس وقت تقریباً دو سال تھی، میرا نکاح کر دیا۔ نکاح کی قبولیت ..... مذکور کے لئے اُس کے بڑے بھائی ..... نے کی۔

اب جبکہ میری عمر تقریباً بیس سال کی ہو چکی ہے۔ اور لڑکا تقریباً اکیس سال کا ہے تو ہمارے آپس کے حالات اس قسم کے ہیں کہ میں کسی شکل میں بھی ..... مذکور کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ میں اُسے مطلق طور پر پسند نہیں کرتی۔ میری اور اس کی طبیعت اور خیالات بالکل متضاد ہیں۔

چنانچہ میرے والدین نے میری نارضامندی کو دیکھتے ہوئے کوشش کی ہے کہ یہ نکاح فسخ ہو جائے مگر فریق ثانی ..... ہزار روپے کی رقم بعوض طلاق طلب کرتے ہیں۔ اور یہاں حالت یہ ہے کہ..... ہزار تو بجائے خود رہے ..... روپے کی ادائیگی بھی مشکل ہے۔

مجھے بالغ ہوئے تقریباً سات آٹھ سال ہو گئے ہیں اور میری زندگی برباد ہو رہی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے چند ایک خیر خواہوں کی معرفت علاقے کے مولویوں سے مسئلہ پوچھا۔ بعض کے نزدیک چونکہ یہ نکاح والد کا کیا ہوا ہے اور والد اولاد کے لئے شفیق ہوتا ہے، لہٰذا یہ نکاح تادم حیات بلا طلاق کے فسخ نہیں ہو سکتا، چاہے میں ساری عمر گھٹ گھٹ کر بالآخر جان دے دوں۔

لیکن کچھ علما ایسے بھی ہیں جو اس بنا پر اس مجوزہ نکاح کو نکاح ہی تسلیم نہیں کرتے جو بغیر میرے ایجاب و قبول اور عدم علمیت میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ اُن کے فیصلے کے مطابق میں جب چاہوں نکاح ثانی کر سکتی ہوں۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ ہر دو میں سے کون سا فیصلہ درست ہے جو احکام خداوندی کے مطابق ہو۔ اس صورت میں مجھے مشورہ دیا گیا ہے کہ میں آپ کی طرف رجوع کروں۔ براہ کرم آپ میری حالت زار پر رحم فرماتے ہوئے میری مشکلات کا حل تجویز فرما دیں۔ اور عند اللہ ماجور ہوویں۔

(یہ امر قابل ذکر ہے کہ میرا ..... کے ساتھ سوائے شناسائی کے قطعی طور پر کوئی تعلق یا واسطہ

نہیں ہوا۔ نہ میں اس کے گھر گئی اور نہ ہی وہ کبھی ہمارے گھر آیا۔)

یہ بات زیادہ مناسب ہوگی کہ میرے سوال کا جواب بذریعہ طلوعِ اسلام دیا جاوے تاکہ وہ دیگر گم کردہ راہ اشخاص اور ان کے مقابل مظلوم اور بیکس مخلوقِ خدا کی ہدایت کا باعث ہو۔

طلوع اسلام یہ خط ویسے تو صرف ایک خاتون کی طرف سے ہے لیکن ترجمانی کر رہا ہے ان لاکھوں مظلوم عورتوں کی جو بھیڑ بکریوں کی طرح قصابوں کے سپرد کر دی جاتی ہیں اور جہاں پھر ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے — گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

قرآن نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے جو تراضی مابین (فریقین کی مرضی) سے طے پاتا ہے۔ (واخذن منکم میثاقا غلیظا۔ پ) دنیا کے ہر قانون میں معاہدہ (Agreement) کے لئے بالغ ہونا شرط ہے۔ قرآن کا اعجاز ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے بلوغت کو سن نکاح سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی بلوغت اسے کہتے ہیں جب لڑکا یا لڑکی نکاح کی عمر کو پہنچ جائے۔ سورۃ النساء کے شروع میں مذکور ہے کہ جب کوئی بچے یتیم رہ جائیں تو تم ان کے اموال و جائداد کی حفاظت کرو اور ان کی دیکھ بھال کرتے رہو۔ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (پ) یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اس وقت ان کے اموال و جائداد ان کے سپرد کر دو (بشرطیکہ وہ فاتر العقل نہ ہوں)۔ یہاں یہ حقیقت بلاشک و شبہ سامنے آگئی کہ قرآن کی رو سے نکاح کی عمر، بلوغت کی عمر ہے۔ بلوغت سے پہلے نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی صراحت فرما دی کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا (پ) یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ۔ یعنی مرد اس عورت سے شادی کرے جو اسے پسند ہو (ما طاب لکم من النساء پ) اور عورت کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ بلوغت سے قبل نہ لڑکے کا نکاح، نکاح ہے اور نہ لڑکی کا عقد، عقد۔ یہ تلاعب بالدین (دین سے مذاق) ہے۔ اور دنیا و آخرت میں رسوائی کا موجب۔ نکاح کے لئے ایجاب و قبول ایک لاینفک شرط ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی بچہ کا ایجاب و قبول کچھ معنی ہی نہیں رکھتا۔ "ایجاب و قبول" کی رسم اب بھی ہمارے ہاں رائج ہے لیکن جس طرح آج کل اس کی مٹی پلید ہو رہی ہے (بالخصوص لڑکیوں کے معاملہ میں) وہ ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں نابالغ تو ایک طرف بالغ لڑکیوں سے بھی کون پوچھتا ہے کہ تمہارا نکاح کہاں کیا جائے؟ منوسمرتی (ہندوؤں کی معاشرت) میں لڑکی کے متعلق لکھا ہے کہ اسے ساری عمر دوسروں کی مرضی کے تابع رہنا ہوگا۔ لڑکی ہے تو ماں باپ کی، بیوی ہے تو مرد کی اور بیوہ ہے تو لڑکے کے رحم و کرم پر۔ وہ دنیا میں کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی۔ یہی کچھ

ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب رسول اللہؐ نے حضرت عائشہؓ سے شادی کی ہے تو ان کی عمر چھ برس کی تھی، اس لئے بچپن کی شادی جائز ہے۔ ہم اس وقت اس تاریخی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ یہ کہاں تک درست ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ برس کی تھی یہ ایک جداگانہ مبحث ہے اور تفصیل کا محتاج۔ اس وقت ہم صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ سورۃ النساء کے وہ احکام جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، مدینہ میں نازل ہوئے تھے اور حضرت عائشہؓ کا نکاح اس سے قبل ہو چکا تھا۔ لہٰذا اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر بلوغت سے کم تھی تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اس باب میں قرآن کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ ان احکام کے نزول کے بعد کوئی واقعہ ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہی سمجھی جائے گی جیسے رسول اللہؐ نے اپنی تین صاحبزادیوں (حضرت زینبؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت رقیہؓ) کی شادیاں اپنے خاندان کے جن لڑکوں سے کی تھیں وہ مشرک تھے اور قرآن میں مومن عورت کی شادی مشرک مرد سے جائز نہیں لیکن یہ شادیاں اس زمانہ میں ہوئی تھیں جب قرآن کا یہ حکم نازل نہیں ہوا تھا کہ مشرک سے شادی جائز نہیں۔

فلہٰذا آج ہمارے لئے واجب الاتباع قرآن کے وہ احکام ہیں جو اس باب میں مذکور ہیں اور ان احکام کی رو سے بلوغت سے پہلے نکاح ہو نہیں سکتا اور نکاح کے لئے بہرحال فریقین کی رضامندی ضروری ہے لیکن ہماری بدبختی کہ ہمارے ہاں نکاحِ بالغان نہ صرف مروج ہی ہے بلکہ اسے "عینِ دین" سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب ہندوستان میں سارداایکٹ پیش ہوا ہے جس کی رو سے نکاح بالغان ناجائز قرار دیئے جانے کی تجویز تھی، تو اس بل کی مخالفت میں سناتنی ہندوؤں کی ہم نوائی میں مسلمان بھی نہایت شد و مد سے شریک تھے۔ اور اس انداز سے شریک کہ گویا وہ بل ان کے دین کے کسی بنیادی رکن کو منہدم کر رہا تھا۔ ہمارے ارباب شریعت کبھی کسی مسئلہ پر متفق نہیں ہوئے۔ مختلف فرقے، مختلف مسائل میں اپنے اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں اور آپس میں ہمیشہ مصروفِ جدل و پیکار رہتے لیکن یہ ہماری سوختہ بختی کی انتہا تھی کہ سارداایکٹ کی مخالفت میں مسلمانوں کے تمام فرقے متحد اللسان تھے اور اس باب میں جو وفدِ عظیم وائسرائے کے پاس پہنچا تھا اس میں قریب قریب ہر فرقے کے نمائندے موجود تھے، یہ تمام ارباب شریعت ایک عیسائی حکمران کے حضور یہ کہنے کے لئے جا رہے تھے کہ اس ہندو کے بل کو پاس نہ کر دیا جائے جو نابالغوں کا نکاح ناجائز قرار دے رہا ہے۔ ان کا وفد یہ کہنے جا رہا تھا اور آسمان ان کی اس حرکت پر رو تا تھا اور دنیا ہنستی تھی۔

بہرحال، یہ ہے نکاحِ نابالغان سے متعلق قرآن کا فیصلہ۔ ہمیں تفصیلاً معلوم نہیں کہ ملک کا حالیہ

قانون اس باب میں کیا کہتا ہے اور ہمارے ہاں جو شادیاں بچپن میں کردی جاتی ہیں وہ انھیں از خود فسخ کردینے کی اجازت دیتا ہے یا اس کے لئے عدالت کے فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس باب میں کسی وکیل سے پوچھ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ مروجہ قانون اپنی مخالفت کو جرم قرار دیتا ہے خواہ یہ مخالفت قرآن ہی کے کسی حکم کے تحت کیوں نہ ہو۔

۲۔ عورتوں کو مارنا

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ قرآن میں مردوں کو اجازت دی گئی ہے۔ (بلکہ حکم دیا گیا ہے) کہ وہ اگر عورت میں سرکشی دیکھیں تو انھیں سمجھائیں، اور اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو ان سے علیحدگی اختیار کرلیں اور اگر اس پر بھی وہ اپنے آپ کو درست نہ کرلیں تو انھیں پیٹا جائے۔ اس سے مرد کے اختیارات ایسے وسیع ہوجاتے ہیں کہ عورت بچاری اس کے سامنے بھیڑ بکری بن کر رہ جاتی ہے۔ کیا قرآن کا واقعی یہی منشاء ہے!

طلوع اسلام

قرآن کا یہ منشاء قطعاً نہیں ہے۔ ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے ان احکام کو انفرادی سمجھ رکھا ہے۔ یعنی ہم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ قرآن ہر مرد کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور جس وقت وہ خود فیصلہ کرلے کہ عورت اپنی سرکشی سے باز نہیں آتی اسے سزا دینا شروع کردے اور اس سزا میں مار پیٹ بھی شامل ہے۔ تعزیری احکام کے معاملہ میں سب سے پہلے یہ اصول ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ وہ احکام افراد کے لئے نہیں ہیں بلکہ حکام کے لئے ہیں۔ یعنی ان عدالتوں کے لئے جو حکومت قرآنی کی طرف سے ان امور کے لئے مقرر کی جائیں۔ پھر، عائلی زندگی میں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کی رو سے جو حقوق و فرائض مردوں کے لئے ہیں اسی کی مثل حقوق و فرائض عورتوں کے ہیں۔ یہ قانونِ معاشرت کی اصل ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ عائلی زندگی میں قرآن پہلے باہمی افہام تجویز کرتا ہے۔ وان امرأۃ خافت من بعلھا نشوزا او اعراضا فلا جناح علیھما ان یصلحا بینھما صلحا (۴/۱۲۸) "اگر کسی عورت کو اپنے خاوند سے سرکشی یا اعراض کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ آپس میں صلح کرلیں"۔ یعنی ضروری نہیں کہ معاملہ کو یونہی عدالت تک لے جائیں۔ اسی طرح واللتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن (۴/۳۴) "جن عورتوں سے سرکشی کا ڈر ہو تو اس کے لئے پہلے تو باہمی افہام و تفہیم سے صلح صفائی کی کوشش کرنی چاہئے لیکن اگر معاملہ اس سے نہ سلجھے تو پھر بات حکام تک جائے گی۔ اب فیصلہ وہاں سے صادر ہوگا۔ اگر عورت کا جرم ثابت ہوگیا تو ہلکی سزا تو یہ ہے کہ اسے ایک مدت معینہ کے لئے خاوند سے الگ کردیا جائے اور انتہائی صورت میں ایسا بھی ہوسکتا ہے

کہ اسے بدنی سزا دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی جرم مرد کے خلاف ثابت ہوگا تو اسے بھی اسی قسم کی سزا ملے گی۔ لہٰذا یہ تعزیری احکام، عدالت کی راہنمائی کے لئے ہیں۔ سزا کی مجاز صرف عدالت ہو سکتی ہے۔ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے، خواہ مرد ہو یا عورت۔ حتیٰ کہ طلاق میں بھی انفرادی اختیار نہیں ہے۔ میاں بیوی، دونوں کی باہمی شکر رنجی کی صورت میں، عدالت پہلے ثالث مقرر کرے گی اور ان ثالثوں کی رپورٹ کے بعد وہ فیصلہ دیگی کہ باہمی موافقت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے یا انقطاعِ تعلقات ناگزیر ہے۔ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ جب چاہے اپنی عورت کو طلاق دیدے۔ (دیکھئے ۴/۳۵)۔

لہٰذا، تعزیری احکام کے متعلق یہ حقیقت ہمیشہ سامنے رکھنی چاہیئے کہ ان کا خطاب حکام (عدالتوں) سے ہے، افراد سے نہیں۔ اسلامی نظام میں یہ تمام معاملات، حکومت کی طرف سے متعین کردہ قضاۃ (Judges) فیصل کریں گے اور سزائیں بھی حکومت کی طرف سے ملیں گی۔ نہ کہ افراد اپنی مرضی اور اختیار سے جو جی میں آیا کریں گے۔ پھر یہ حدود بھی حکومت متعین کریگی کہ جرم کی کس نوعیت میں کس حد تک کی سزا دی جائے گی۔ قرآن کی مقرر کردہ سزائیں، انتہائی سزائیں ہیں [اور یہ سزائیں چار یا پانچ جرائم سے زیادہ کے لئے متعین ہی نہیں۔ وہ جرائم جن سے حفاظتِ نفس (قتل)، حفاظتِ اموال (سرقہ)، حفاظتِ عصمت (زنا اور قذف) اور حفاظتِ مملکت (بغاوت) خطرہ میں پڑ جائے] یہ حکومت کا فریضہ ہوگا کہ وہ ان حدود و قیود کو متعین کرے جن کی رو سے یہ انتہائی سزائیں دی جائیں گی اور ان احوال و ظروف (Circumstances) کی تعیین کرے جن میں معافی دی جائے گی یا انتہائی سزا سے کم درجہ کی سزا دی جائیگی۔ بہرحال، یہ بحث الگ ہے۔ استفسار زیرِ نظر کا جواب پہلے آچکا ہے۔

۳۔ تصویر

شاید ہی کوئی ماہ ایسا گذرتا ہو جس میں یہ استفسار موصول نہ ہوتا ہو کہ شریعت کی رو سے تصویر کھنچوانا یا اس کا اپنے پاس رکھنا کیسا ہے۔ طلوعِ اسلام میں اس کے متعلق ایک دو مرتبہ لکھا جا چکا ہے اب اسے پھر دہرایا جاتا ہے۔

قرآن میں تصویر کی ممانعت کہیں نہیں۔ بلکہ حضرت سلیمانؑ کے تذکارِ جلیلہ کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ ان کے پاس دور دراز ملکوں کے اجنبی صناع جمع تھے، یعملون لہٗ ما یشاء من محاریب و تماثیل (۳۴/۱۳)۔ جو ان کی منشاء کے مطابق بڑی بڑی محراب دار عمارتیں اور تماثیل تیار کرتے تھے۔ تماثیل تمثال کی جمع ہے اور تمثال میں تصاویر اور مجسمے دونوں شامل ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب (i) خدا کا ایک

اولوالعزم رسول تصاویر اور مجسموں کو تیار کراتا ہو اور (۱) قرآن اس کا ذکر کر رہا ہو اور (۱۱) اس کی ممانعت کہیں نہ آئی ہو تو پھر از روئے قرآن تصویر کی ممانعت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ روایات میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ لیکن اول تو روایات کا ظنی ہونا انھیں دین میں سند کی حیثیت نہیں دیتا اور اگر ان کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے رسول اللہ نے کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ان کی ممانعت کر دی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ازمنہ مظلمہ (زمانہ جہالت) میں انسان مظاہر پرست اور انسان پرست واقع ہوا تھا اس لئے وہ مجسمات اور تصاویر کی پرستش شروع کر دیتا تھا۔ لیکن ہر مجسمہ اور ہر تصویر کی نہیں بلکہ صرف انہی کے مجسموں اور تصویروں کی جن کی اُسے پرستش مقصود تھی۔ لہذا وجۂ ممانعت، مظاہر فطرت یا انسانوں کی پرستش تھی نہ کہ نفسِ تماثیل۔ اگر اس دلیل کو محکم تسلیم کر لیا جائے کہ انسان (اللہ کے سوا) جن چیزوں کی پرستش کرتا ہے انھیں باقی نہیں رہنے دینا چاہئے تاکہ دنیا سے شرک مٹ جائے، تو غور فرمائیے کہ اس سلسلہ کائنات میں کس کس چیز کو مٹانا پڑے گا۔ انسان، پہاڑوں اور دریاؤں کی پرستش کرتا ہے۔ درختوں اور حیوانوں کی پرستش کرتا ہے۔ زمین کی اور اجرام سماوی (چاند، سورج، ستاروں) کی پرستش کرتا ہے۔ وہ ان چیزوں کی تصاویر کی پرستش نہیں کرتا بلکہ خود ان چیزوں کی پرستش کرتا ہے۔ تو کیا اس شرک کو مٹانے کے لئے ان تمام چیزوں کو مٹا دیا جائے گا جن کی یہ پرستش کرتا ہے! کیا ان کا مٹانا ممکن بھی ہے؟ انسان پرستی میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے مٹا دینے سے ان کی پرستش نہیں ہوگی۔ لیکن ذرا گہرائیوں میں جا کر دیکھئے کہ کیا ان کے مٹانے سے واقعی شرک مٹ جاتا ہے! اگر آپ ان تصاویر کو مٹا بھی دیں گے تو ان تصاویر کو کیا کریں گے جو انسان نے اپنے قلب کے چوکھٹوں میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ آپ اگر شیخ کی تصویر سامنے نہیں رکھنے دیتے تو وہ مراقبہ میں "تصورِ شیخ" سے اپنے سینہ کو بتکدہ بنا لیتا ہے۔ سوال شے انسان کے دل اور دماغ کے بتکدوں کو معبودانِ باطل سے پاک کرنا ہے۔ اگر ان کی تطہیر ہو جائے تو خارجی معبود (تصاویر اور مجسمے، بلکہ زندہ انسان) از خود فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں یہ بت موجود رہیں تو محسوس و مشہود بتوں (تصویروں اور مجسموں) کے استیصال سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ کتنے مسلمان ہیں جو تصویر کشی، مجسمہ سازی، قبر پرستی کو حرام سمجھتے ہیں لیکن ان کے سینوں کو ٹٹول کر دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان میں کتنے کتنے بڑے لات اور منات اور ہبل اور عزیٰ چھپے بیٹھے ہیں۔

رہ مدہ اقبال را در کعبہ اے شیخِ حرم
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

لہٰذا اصل شے تو غیر اللہ کی پرستش ہے جس سے روکنا مقصود ہے، نہ کہ نفسِ تصویر۔ "آغا خانیوں" میں چونکہ سر آغا خاں کی پرستش کی جاتی ہے لہٰذا ان کی ہر تصویر معبود کی حیثیت رکھتی ہے اور اس فرقہ کا جاہل اور سمجھدار ہر شخص اس تصویر کی پرستش کرتا ہے۔ اس کے برعکس، قائداعظم مرحوم کی تصویر مسلمانوں کے قریب قریب ہر گھر میں موجود ہے لیکن سمجھدار طبقہ تو ایک طرف، جہلا میں سے بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس کی پرستش کرے۔ معہذا چونکہ قبر پرستی مسلمانوں میں عام ہے اس لئے اس قائداعظم کی قبر کی پرستش کے آثار آہستہ آہستہ ابھرتے چلے آرہے ہیں۔ لہٰذا تصویر بجائے خویش کوئی ایسی چیز نہیں جسے شجر ممنوعہ قرار دیدیا جائے۔

لیکن اگر آپ تاریخ اسلام (مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ) کا بہ تعمق نگاہ مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کے دلوں میں تصاویر کے متعلق جو نفرت پائی جاتی ہے اس کی وجہ وہ نہیں جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے بلکہ اس کی تہ میں کچھ اور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چیز شعوری طور پر مسلمان کے سامنے نہ ہو لیکن اس کا تحت الشعور اس سے متاثر ہے اور اس تاثر کو اس نے مذہب کا سہارا دے کر قائم کر رکھا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جو اسلام ہمارے ہاں مروج ہے وہ وہ اسلام نہیں جو اللہ نے بوساطت نبی اکرمؐ دنیا کو دیا تھا۔ ہمارا اسلام، مجموعہ ہے ان غیر اسلامی نظریات و تصورات کا جو رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر اجزائے اسلام بنائے جاتے رہے۔ ان تصورات میں، عیسائیت کی رہبانیت کو خاص دخل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے موجودہ اسلام کا بیشتر حصہ اسی رہبانیت پر مشتمل ہے۔ عیسائی خانقاہیت میں دنیا کی ہر حسین شے سے نفرت سکھائی جاتی تھی۔ ان کے اولیاء (Saints) کے حالات پڑھیے وہ اسقدر گھناؤنی زندگی بسر کرتے تھے کہ اس کے تصور سے روحِ نظافت میں جھرجھری آجاتی ہے۔ ان میں سے جو ولی سب سے زیادہ کریہہ المنظر اور نفرت آگیں حالات میں رہتا تھا وہی سب سے بڑا قطب تصور کیا جاتا تھا۔ اگر کسی کو ساری عمر میں ایک مرتبہ ہنسی آگئی (یا تبسم سے لب کشائی ہو گئی ہے) تو اسے سالہا سال تک اس کا کفارہ دینا پڑتا تھا۔ جب حسن فطرت سے متعلق ان کا یہ زاویۂ نگاہ تھا تو حسن نسائیت کے متعلق ان کا جو تصور ہو گا وہ ظاہر ہے۔ چونکہ مجرد کی زندگی ان کے نزدیک "منہاجِ نبوت" کی زندگی تھی اس لئے ان کے عقیدہ میں عورت، دنیا کی بدترین جنس تھی۔ یہی وہ روحِ خانقاہیت جو آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اسلام کا جزو بن گئی۔ اس تاریخی پس منظر کے ساتھ آپ اس زندگی کی تصویر کا مطالعہ کیجئے جسے ہمارے ہاں ایک متقی، پرہیزگار، دیندار، مزکی

مقدس انسان کی زندگی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ فلاں بزرگ چالیس سال تک متواتر روتے رہے حتیٰ کہ ان کے رخساروں کا گوشت بھی گل سڑ گیا۔ فلاں بزرگ بیس سال تک سوئے نہیں۔ فلاں نے عمر بھر گیہوں کی روٹی نہیں کھائی۔ فلاں صاحب کے جسم میں کیڑے پڑ گئے۔ جونہی کوئی کیڑا زخموں سے نیچے گر جاتا تھا وہ اسے اٹھا کر پھر زخم میں رکھ لیتے تھے۔ فلاں بزرگ کی جوئیں مگر گیہوں جتنی بڑی تھیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس سے آگے بڑھے تو اس "مقدس تصورِ زندگی" کو خود ذاتِ رسالتمآبؐ اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کر دیا۔ کتب سیر و آثار کو دیکھئے، ان میں مقدس زندگیوں کی تصویریں اسی قسم کی ملیں گی۔

"حضورؐ ساری عمر اس طرح تبسم نہیں ہوئے کہ کسی نے دانت مبارک دیکھ لیا ہو۔ گھر میں چالیس چالیس دن تک آگ نہیں جلتی تھی۔ گیہوں کا آٹا کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ چھلنی کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ کپڑوں پر بیسوں پیوند لگے رہتے تھے۔ ان کی مجالس و محافل میں کبھی شگفتگی و شادابی نے بار نہیں پایا تھا۔ زندگی کے لطیف و خوشگوار پہلوؤں سے وہ ہمیشہ مجتنب رہتے تھے۔ تزئین و آرائش ان کے ہاں مطلقاً حرام تھی۔ دولت و ثروت، وہ شجرِ ممنوعہ تھی جس کے چھونے سے انسان جنت سے نکال دیا جاتا ہے۔[1] عورت، وہ ٹیڑھی کمان تھی جسے سیدھا کرنے کی کوشش کیجئے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ وقس علیٰ ہذا"۔

اس قسم کی زندگی کو مقدس ترین زندگی بتا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور ہر منبر و محراب سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ "دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا"۔ عیسائی خانقاہیت کا اثر اس حد تک گہرا ہو چکا ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ہاں کے اچھے اچھے سمجھدار لوگ جب جنت کا ذکر کریں گے تو وہ اس تصور سے جھینپے جھینپے سے دکھائی دیں گے کہ اس میں ازواج اور حور و عین کا ذکر کیوں آتا ہے۔ وہ اپنی انتہائی کوشش کریں گے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہر چند وہاں ازواج ہوں گی لیکن ان سے جنسی تعلقات قائم نہیں ہوں گے۔[2]

یعنی ان کے نزدیک جنسی تعلق ایک ایسی چیز ہے جسے اس دنیا کی آلودگیوں میں تو گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے بلند و بالا "روحانیت" کی زندگی میں اس کو بالکل دخل نہیں ہو سکتا۔ ان کے خیال میں اگر جنت میں بھی جنسی تعلق باقی رہا تو ساری جنت پلید ہو جائیگی۔ آپ نے غور فرمایا کہ جنسی

---

[1] واضح رہے کہ بنا بر استغنا، سادہ زندگی بسر کرنا اور شے ہے اور دولت و ثروت اور زیبائش و آرائش کو قابلِ نفرت سمجھنا اور شے۔ ہمارے ہاں کے تصورِ دین میں ان چیزوں کو قابلِ نفرت قرار دیا جاتا ہے۔

[2] ہم اس وقت جنت اور اس سے متعلقات کی قرآنی تصریحات سے بحث نہیں کر رہے۔ بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ "جنسی تعلق" کو ہمارے ہاں کس طرح روحانی زندگی کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

تعلق کو روحانیت کی زندگی کے نقیض تصور کرنے کا خیال کہاں سے آیا؟ یہ اسی عیسائیت کا اثر ہے جس میں تجرد کی زندگی کو روحانیت کی بلند ترین زندگی بتایا گیا ہے اور یہی اثرات ہمارے ہاں عقائد بن چکے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے "دین" میں احساسِ حسن کہاں باریا سکتا ہے! اور ظاہر ہے کہ جہاں حسن (Beauty) کو اس درجہ قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہو وہاں حسن کے مظاہر (وہ فطری ہوں یا انسانی کوششوں کے نتائج) کس طرح قابلِ ستائش قرار پا سکتے ہیں!

یہ ہے اصل وجہ تصویر (اور دیگر فنونِ لطیفہ) کی "حرمت" کی۔ "اسلام اور آرٹ" ایک وسیع موضوع ہے جس پر اس طرح ضمناً گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اگر کشاکشِ روزگار نے فرصت دی تو اس باب میں بھی مفصل گفتگو کی جا سکے گی۔ اس وقت ہم صرف ان اشارات تک اکتفا کرتے ہیں کہ حسن کے متعلق یہ اس قوم کا زاویہ نگاہ ہے جس کے خدا نے نیکی کے لئے بھی حسن کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور جنت کے لئے بھی حسن مآب۔ یعنی جس عمل میں حسن نہیں (یعنی زندگی کا جو کام حسین نہیں) وہ اس کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ حسن کیا ہے؟ توازن و تناسب۔ جونہی کسی شے کا توازن (Proportion) بگڑا، اس میں فساد رونما ہو گیا۔ کائنات کا یہ تمام سلسلہ اس حسن (توازن) پر قائم ہے۔ تخلیق کے ساتھ تحسین، یہاں کا آئین محکم ہے۔ اشیائے کائنات صرف پیدا ہی نہیں کی جاتیں بلکہ انہیں حسین ترین انداز میں پیدا کیا جاتا ہے۔ الذی احسن کل شئ خلقہ (۳۲/۷) اللہ وہ ہے کہ اس نے جو چیز بنائی، حسین ترین (احسن) انداز میں بنائی۔ وانبتنا فیھا من کل شئ موزون (۱۵/۱۹) "ہم نے زمین میں ہر شے توازن و تناسب کو لئے ہوئے اگائی"! خود انسانی صورت میں بھی اس اعتدال و تناسب کو ملحوظ رکھا جس پر حسن کا مدار ہے۔ الذی خلقک فسوّٰک فعدلک (۸۲/۷) "وہ خدا جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھیک درست کیا، پھر تمہارے قویٰ اور صورت میں تناسب و اعتدال ملحوظ رکھا۔"

پھر اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا گیا کہ موزونیت و تناسب اور تحسین و تزئین کا یہ انداز سلسلۂ تخلیق ہی کا ایک جزو نہیں کہ اس سے، اس کے سوا کچھ اور مقصد نہ ہو۔ بلکہ آرائش و جمال کی یہ تمام آئینہ گری، انسان کی نظر افروزی اور ذوقِ لطیف کی تسکین کے لئے ہے۔ غور کیجئے! یہ تمام اجرام فلکی، اس سلسلۂ کائنات میں جذب و کشش کے ثقیل الجثہ مظاہرے ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بھی فرما دیا کہ سقفِ سماوی کی یہ مرصع کاری، تمہاری نگاہوں کے لئے سامانِ زینت ہے۔ افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینٰھا وزینّٰھا (۵۰/۶) "کیا ان لوگوں نے کبھی آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے اور کس طرح اس کے منظر میں خوشنمائی پیدا کر دی ہے"۔ دوسری

جگہ ہے۔ ولقد جعلنا فی السماء بروجا وزینھا للنظرین (۱۵/۱۶) "اور ہم نے آسمان میں (گردشِ سیارگان کے لئے) بروج بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لئے باعثِ زینت بنا دیا۔ آسمان سے نیچے اتر کر زمین کی طرف دیکھئے۔ انبتنا فیھا من کل زوج بھیج (۵۰/۷) اس میں قسم قسم کی خوبصورت نباتات پیدا کر دی، حتیٰ کہ تمہارے مویشی، جن سے تم نے باربرداری کا کام لینا تھا، ان کی بھی یہ کیفیت ہے کہ ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون (۱۶/۶) جب تم انہیں شام کے وقت چراگاہوں سے واپس لاتے ہو اور صبح کے وقت لے جاتے ہو تو تمہارے ان مویشیوں میں تمہارے لئے حسن و جمال کا سامان ہوتا ہے۔

آپ قرآن کے مختلف مقامات پر نگاہ ڈالئے۔ تخلیق و تعمیر کے ساتھ ساتھ تحسین و تزئین کی یہ تمام جمال آرائیاں آپ کے سامنے آجائیں گی جن کی طرف آپ کو بار بار دعوتِ نظارہ دی جائے گی۔ اور وہ دعوت بھی اس انداز سے کہ

ما تری فی خلق الرحمٰن من تفوت۔ فارجع البصر ھل تری من فطور۔
ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیر۔ (۶۷/۳)

تم خدائے رحمٰن کی تخلیق میں کوئی اونچ نیچ نہیں پاؤ گے۔ ایک بار نہیں، بار بار دیکھو، کیا تمہیں کوئی سلوٹ نظر آتی ہے۔ تم اسی طرح بار بار دیکھتے رہو۔ تمہاری نگاہ اٹھے گی اور اسی طرح خاسر و درماندہ کا شائقِ چشم میں واپس آجائے گی۔ لیکن صنعت گاہِ کائنات میں کہیں کوئی جھول نہ پا سکے گی۔

جس خدائے کائنات کی جمال آفرینیوں کا یہ عالم ہو کیا وہ آرائش و زیبائش اور حسن و جمال کی تمام راہیں اپنے بندوں پر حرام قرار دیدے گا؟ سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔

قرآن تو اس نمائش گاہِ حسن و تزئین کی طرف بار بار دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ اس لئے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا، گویا اس کے صانع پر یہ تہمت دھرنا ہے کہ تم نے یہ سامانِ زیبائش و تحسین یونہی بیکار پیدا کر دیا۔ اور پھر جب یہ تمام جمال آفرینی بھی مقصدِ تخلیقِ کائنات میں سے ہے تو ظاہر ہے کہ خود فطرتِ انسان کی تعمیر و ارتقاء میں اس کا کتنا بڑا حصہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آنکھ حسن و جمال کی نیرنگیوں سے کیف اندوز نہیں ہو سکتی، وہ انسان کا دیدۂ بصیرت نہیں، حیوان کا آلۂ بینائی ہے۔

اور جو قوم ذوقِ حسن و زیبائی سے بے بہرہ ہو جاتی ہے۔ اس پر رموزِ کائنات کی گرہ کشائیاں حرام ہو جاتی ہیں۔ کائنات، جمالیاتی (Aesthetic) اور افادی (Utilitarian)

گوشوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ انسان چونکہ ہمیشہ افراط و تفریط کے جھولوں میں جھولتا چلا آیا ہے اس لئے اس کا مسلک یہ رہا ہے کہ کبھی وہ محض جمالیاتی رنگ میں ڈوب گیا اور کائنات کے افادی پہلو سے کنارہ کش ہو گیا۔ یہ یکسر جذباتی دنیا تھی جس نے انسان کو دنیائے ممکنات میں بیکار کر کے رکھ دیا۔ اور کبھی یہ تفریط کی طرف آیا تو یکسر افادی پہلو کو مسلکِ حیات قرار دے لیا۔ اس میں یہ کائنات محض تجارت گاہ بن گئی۔ اسلام نے آ کر بتایا کہ کائنات کے ان دونوں گوشوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔ یعنی

حمدیت (Utilitarian) اور ربوبیت (Appreciative) دونوں کا منبع اسی کی ذات ہے۔ یہ تھا مسلمان کا خدا، لیکن آج مسلمان کی یہ حالت ہے کہ اس میں نہ حمدیت کا کوئی رنگ ہے اور نہ ربوبیت کی کوئی شان۔ خسر الدنیا والآخرۃ ذالک الخسران المبین۔

قربانی

گذشتہ اشاعت میں قربانی سے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا اس نے ذہنی اور قلبی فضا کو بڑی حد تک مرتعش کیا۔ جنہیں قرآن کے نام سے چڑ ہے انہوں نے حسبِ عادت مقدس گالیوں سے نوازا۔ سلیم فطرت سعید روحوں نے خدا کے حکم کے سامنے اپنے دل اور نگاہ کو جھکا دیا۔ بعض تحقیق پسند ذہنوں کی طرف سے مزید استفسارات موصول ہوئے۔ ان استفسارات میں ایک ایسا بھی ہے جسے ہم طلوعِ اسلام کے صفحات پر لے آنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سورۂ کوثر تین آیات پر مشتمل ہے۔

(۱) انا اعطینٰک الکوثر۔　　ہم نے تجھے کوثر بخشا۔

(۲) فصل لربک وانحر۔　　پس اپنے رب کیلئے نماز پڑھ اور اسی کیلئے نحر کر۔

(۳) ان شانئک ھو الابتر۔　　تیرا دشمن محروم و نامراد رہے گا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ اس میں آیت ۲ (وانحر) سے قربانی کا حکم ثابت ہے۔ ہم اس وقت اس جلیل القدر سورت کے تفصیلی مطالب بیان نہیں کرنا چاہتے۔ موضوعِ گفتگو کو صرف وانحر اور اس کے متعلقات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ اس آیت کے عام معنی کئے جاتے ہیں۔

"پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور قربانی کر"

لہٰذا اس میں سب سے پہلے نحر کے معنی غور طلب ہیں۔ آپ کتبِ لغت اور تفاسیر کو دیکھئے اس لفظ کے متعدد معانی نظر آئیں گے۔

امام راغب لکھتے ہیں کہ النحر موضع القلادۃ من الصدر "نحر" چھاتی کے اوپر گلو بند کے مقام کو کہتے ہیں" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "النحر میں ہاتھوں کو نحر کے مقام پر رکھنے کا حکم ہے" چنانچہ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نحر سے مطلب نماز میں ہاتھوں کو چھاتی کے اوپر رکھنا ہے۔ عطا کا بیان ہے کہ وانحر کے معنی یہ ہیں کہ دو سجدوں کے درمیان اس طرح سیدھا ہو کر بیٹھ کہ تیری چھاتی نمایاں ہو جائے۔ ضحاک وغیرہ کا قول ہے کہ دعا کے بعد دونوں ہاتھ چھاتی کے اوپر کے حصہ تک بلند کرو۔ امام بیہقی کے نزدیک اس کے معنی نماز میں ہاتھ پر ہاتھ رکھنا ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ اس سے مفہوم قبلہ کی طرف منہ کرنا ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز میں محراب کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا ہے۔

امام بازی اس سے "اونٹ ذبح کرنا" مراد لیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ قول العامۃ المفسرین ان المراد ھو نحر البدن۔ یعنی تمام مفسرین اس سے نحر شتر مراد لیتے ہیں۔ یعنی یہ اس لفظ کے اصلی معنی نہیں، مرادی معنی ہیں۔

اب ان تمام مختلف معانی میں سے اگر نحر کے معنی "اونٹ ذبح کرنا" ہی لے لئے جائیں، تو بھی اس سے (۱) قربانی کرنا اور (۲) بھی (۳) ہر گلی کوچہ میں قربانی کرنا کس طرح ثابت ہو سکتا ہے؟ "فصل لربك وانحر" میں صل (نماز پڑھ) اور انحر (اونٹ ذبح کر) کا حکم مطلق (عام) ہے اسے مقید (خاص) کر کے صل سے مراد "عید کی نماز" اور نحر سے مراد "اونٹ کی قربانی" کس اصول کے ماتحت لی جا سکتی ہے!

کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس سے مراد "اونٹ کی قربانی" نہیں تو پھر اس حکم کے معنی کیا ہیں؟ اس کیلئے ہمیں سورۂ کوثر کی پوری تفسیر لکھنی ہوگی جس کے لئے اس وقت گنجائش نہیں۔ اشارۃً یوں سمجھئے کہ عام اقوال کے مطابق، یہ سورہ ہجرت سے ذرا پہلے مکہ میں نازل ہوئی۔ زمانہ وہ تھا کہ نبی اکرمؐ چاروں طرف سے مخالفتوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے۔ عام نگاہوں میں آپ کے پیغام حق و صداقت کے دشمن، غالب اور کامیاب دکھائی دیتے تھے۔ حالات یہاں تک ناسازگار ہو چکے تھے کہ آپ مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ ناامیدیوں اور مایوسیوں کی اس تیرہ و تار فضا میں، عین ان مساعد حالات کے اندر آپ کو بشارت دی جاتی ہے کہ گھبرانے اور فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ خدا کے غیر کثیر کے خزانے تمہارے منتظر ہیں۔ اور یہ دشمن، جو اس طرح فخر و تکبر سے اپنے آپ کو کامیاب و شادکام سمجھ رہے ہیں، دنیا بھر کی تباہیاں اور بربادیاں ان کے لئے ہیں۔ ذرا انتظار کرو اور دیکھو کہ یہ انقلاب کس طرح تمہارے سامنے آجاتا ہے۔ مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ جانا تھا۔ وہاں یہود کا بڑا زور تھا۔ دنیاوی ڈپلومیسی پر نگاہ رکھنے والوں کو خیال آسکتا تھا کہ قریش مکہ سے انتقام کی خاطر یہود مدینہ سے سمجھوتا کیا جائے گا۔ قرآن نے اس کی نفی ایک لفظ میں فرما دی۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا۔ ان کے ساتھ سمجھوتہ کی صورت میں

ان کے اِن جذبات کا احترام ضروری تھا۔ لیکن قرآن نے پہلے ہی کہدیا کہ ان سے دب کر سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ ان کے علی الرغم اونٹوں کو ذبح کیا جائے گا۔ یعنی وہاں بھی غلبہ تمہارا ہی رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سورت، فتح مکہ کی بشارت ہے، اور اس بشارت پر کوثر، نحر اور "ان شانئك هو الابتر" کے ٹکڑے صاف دلالت کرتے ہیں۔ قریش کا زور فتح مکہ ہی سے ٹوٹا تھا اور اسی کے ساتھ "یدخلون فی دین الله افواجا" (اللہ کے دین میں لوگوں کے فوج در فوج داخل ہونے کا) "خیر کثیر" کا منظر سامنے آیا تھا۔ چنانچہ بعض مفسرین کا تو یہ بھی خیال ہے کہ یہ سورہ یا تو فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی یا صلح حدیبیہ کے روز (جسے قرآن نے فتح مبین کہا ہے) چنانچہ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ فصل لربك وانحر والی آیت حدیبیہ کے دن نازل ہوئی"

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ

(۱) نحر کے معنی متعدد ہیں: "اونٹ کا ذبح کرنا" اس کے مرادی معنی ہیں۔

(۲) اگر "فصل لربك وانحر" میں نحر سے مراد "اونٹ کا ذبح کرنا" ہی لیا جائے تو بھی یہ حکم عام ہے اس سے ایام تشریق کی موجبہ قربانی کا حکم کس طرح نکل سکتا ہے؟

(۳) عام روایات کے مطابق سورۂ کوثر مکہ میں نازل ہوئی تھی اور اس وقت نہ عید و بقر عید کی نماز تھی۔ (حتی کہ جمعہ کی نماز بھی نہیں) اور نہ ہی قربانی کا کوئی سوال تھا۔

(۴) اگر "وانحر" سے مراد "قربانی" ہے تو اس حکم کے مطابق قربانی صرف اونٹ کی دی جانی چاہیئے، نہ کہ بھیڑ، بکری اور گائے، بیل کی۔ نحر کا لفظ "اونٹ کے ذبح کرنے" کیلئے خاص ہے اور جانوروں کے ذبح کرنے کیلئے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔

(۵) آخر میں یہ کہ اگر تمام بحث کو چھوڑ کر اسے فرض بھی کر لیا جائے کہ وانحر سے مراد قربانی ہے، تو جب قرآن نے قربانی کا مقام متعین کر دیا (یعنی مکہ) تو وانحر کے معنی بھی انہی اونٹوں کی قربانی ہوگی جو حج میں ذبح کئے جاتے ہیں۔

واضح رہے کہ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ قربانی کا مقام بیت العتیق (کعبہ) ہے، اس کے سوا اور کہیں نہیں۔ یہ جو ہم ہر قریہ اور بستی میں عید کے موقعہ پر جانور ذبح کرتے ہیں اس کیلئے خدا نے ہمیں حکم نہیں دیا۔ لہذا اگر بفرض محال سورۂ کوثر میں وانحر سے مراد اونٹ کی قربانی ہی لی جائے تو بھی اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ یہ قربانی ہر مقام پر دی جا سکتی ہے۔ ہم مقام قربانی سے بحث کر رہے ہیں نہ کہ حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے سے۔ حج کی تقریب پر مکہ میں جانور ذبح کرنے کھانے اور کھلانے کے علاوہ دیگر مقامات پر جانوروں کی قربانی کا حکم قرآن میں کہیں نہیں۔ اور یہ وانحر سے بھی ثابت نہیں۔

ان مطالب کیلئے ہم نے معارف القرآن جلد چہارم (زیر طبع) سے استفادہ کیا ہے۔

رفتارِ عالم

کشمیر جولائی کے اواخر میں کراچی میں التوائے جنگ سے متعلقہ سرحدات کے تعین کا جو باہمی فیصلہ پاکستان اور ہندوستان نے کیا، دونوں مستعمرات کی حکومتوں نے اس کی توثیق کر دی ہے۔ اس تصفیہ سے کشمیر کمیشن کی قرارداد اگست کے پہلے حصہ پر عمل درآمد ہو سکا ہے۔ کشمیر کمیشن کے سامنے اس کے بعد دوسرا مرحلہ تھا جسے مذکورہ قرارداد میں متارکہ کہا گیا ہے۔ اس کی رو سے پاکستان کو ریاست کشمیر کی حدود سے اپنی جملہ افواج واپس بلا لینے پر رضامند ہونا تھا۔ نیز اس کی یہ ذمہ داری تھی کہ ان قبائلیوں اور پاکستانیوں کو جو ریاست میں بغرضِ جنگ موجود ہیں ریاست سے نکلوانے کی کوشش کرے۔ محارب قبائلیوں اور پاکستانیوں کے ریاست سے نکل جانے کے بعد اور پاکستان کے یہ اعلان کرنے پر کہ پاکستانی افواج کا انخلا ہو رہا ہے، ہندوستان کو کمیشن سے طے کئے ہوئے طریقے اور رفتار کے مطابق اپنی افواج کا معتدبہ حصہ ریاست سے نکالنا تھا۔ پاکستان کے خالی کئے ہوئے علاقوں کے انتظام کو قرارداد نے "مقامی حکام" کے سپرد کیا۔

کمیشن نے التوائے جنگ کا مرحلہ طے کرا دینے کے بعد متارکہ پر توجہ دی۔ چنانچہ ۹ اگست کو یہ تجویز پیش کی گئی کہ کمیشن کی زیرِ نگرانی دونوں حکومتیں ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کریں۔ دونوں حکومتوں نے اس کانفرنس کی اصل کو تحریراً تسلیم کر لیا۔ چنانچہ ان کی درخواست پر کمیشن نے ایک عارضی ایجنڈا بھی تیار کر دیا جس میں مندرجہ ذیل موضوع شامل تھے۔

۱) ایجنڈا کی منظوری۔

۲) ریاست جموں و کشمیر سے پاکستانی افواج کی واپسی۔

۳) ریاست جموں و کشمیر سے ان قبائلیوں اور پاکستانیوں کی واپسی جو ریاست کے باشندے نہیں اور بغرض جنگ وہاں موجود ہیں۔

۴) ریاست جموں و کشمیر سے بیشتر ہندوستانی افواج کی واپسی۔

۵) دیگر متعلقہ امور۔

دونوں حکومتوں کو اختیار تھا کہ وہ ایجنڈے میں ترمیمات پیش کریں۔

کمیشن کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور پاکستان اور ہندوستان کسی ایجنڈے پر متفق نہ ہو سکے۔ نہ دیگر متنازع فیہ امور سے متعلق ہی کوئی اتفاق رائے ہو سکا۔ بالآخر کمیشن نے ۱۸ اگست کو اعلان کر دیا کہ مجوزہ کانفرنس ترک کر دی گئی ہے۔

ہندوستان بخوبی جانتا ہے کہ استصواب کا نتیجہ اس کے خلاف ہی ہوگا، چنانچہ وہ بلطائف الحیل اس نتیجہ کو ٹال رہا ہے۔ ہر چند اس نے التوائے جنگ کی تجویز کو تو تسلیم کر لیا جو استصواب کی منزل کی سمت قدم اول ہے لیکن اس پہلے قدم کے بعد وہ سوئے منزل گام زنی سے پہلو تہی کر رہا ہے۔ چنانچہ متفق علیہ مسائل کو بھی کٹ حجتیوں سے متنازع فیہ بنا رہا ہے اور نئے شوشے اور فتنے پیدا کر رہا ہے۔ ہر چند یہ امر فیصلہ شدہ تھا کہ متارکہ کے دوران میں آزاد کشمیر کی افواج کو غیر مسلح اور منتشر نہیں کیا جائے گا بلکہ غیر ہندوستانی کشمیر کا انصرام بھی انہی "مقامی حکام" کے سپرد ہوگا، لیکن ہندوستان اس ضد پر اڑا ہوا ہے کہ ان افواج کو فی الفور غیر مسلح کر کے منتشر کر دینا چاہئے۔ آزاد کشمیر افواج کو وہ امن کے منافی سمجھتا ہے حالانکہ وہ اپنی افواج کو ریاست میں باقی رکھ کر ریاست کی رگ جان کو اپنی آہنی گرفت میں رکھنا چاہتا ہے اور سینۂ امن پر کاویں بن کر مسلط رہنا چاہتا ہے۔ اگر جیسا کہ وہ بظاہر کہہ رہا ہے، ہندوستان کا منشا یہ ہے کہ آزاد کشمیر کی افواج کو بدیں وجہ غیر مسلح اور منتشر کر دیا جائے کہ باشندگان کشمیر استصواب میں آزادانہ رائے دے سکیں، تو یہ مطالبہ کہیں زیادہ مناسب اور حق بجانب ہے کہ ہندوستانی کشمیر سے ڈوگرہ اور ہندوستانی فوجیں بھی نکال دی جائیں ڈوگرہ اور بالخصوص ہندوستانی فوجوں کی موجودگی میں استصواب کبھی آزادانہ نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان نے ان مذاکرات میں ایک نیا مطالبہ یہ کیا کہ کشمیر کے شمالی پہاڑی اضلاع کے دفاع کی ذمہ داری ہندوستان کی ہونی چاہئے۔ حالانکہ اگست کی تجاویز میں ان اضلاع کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کے برعکس ان میں بہ صراحت موجود ہے کہ ہندوستان اپنے مقبوضہ علاقے میں اپنی فوجیں رکھے گا۔ باری النظر میں حیرانی ہوتی ہے کہ بین الاقوامی مذاکرات میں ہندوستان ایسے فتور عقل اور حماقت کا ثبوت دے رہا ہے مگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ہندوستان ان لاطائل تنقیحات کی آڑ لے کر استصواب کو متاخر کر رہا ہے۔ ہر وہ حرکت جو یہ نتیجہ پیدا کر سکتی ہے اس کے نزدیک جائز ہے اور معقول ہے۔

مشترکہ کانفرنس کے ترک کے بعد کمیشن نے دونوں حکومتوں کو "تازہ ترین" تجاویز بھیجیں۔ ان تجاویز کا لب لباب یہ تھا کہ دونوں ممالک میں متارکہ کے تصفیہ سے متعلق جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں وہ غیر جانبدار ثالث یعنی امیر البحر نمٹز کے سپرد کئے جائیں۔ گو ان تجاویز کو شائع نہیں کیا گیا تھا تاہم صدر ٹرومین اور وزیر اعظم اٹلی نے پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم کے نام خطوط بھیجے اور کمیشن کی "تازہ ترین" تجاویز کو قبول کر لینے کی اپیل کی۔ "باخبر سیاسی حلقوں" کی رائے میں ان اپیلوں کی حیثیت محض سفارشی تھی

ورنہ امریکہ اور برطانیہ کا مدعا ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ پاکستان اور ہندوستان کے اس اندرونی معاملہ میں کسی قسم کی مداخلت کریں۔ ان گمنام سیاسی حلقوں کی اس وضاحت کے مقابلہ میں امیر البحر نمٹز کا ایک بیان منظر عام پر آیا جس میں یہ تصدیق تھی کہ کمیشن کی تجاویز کو امریکہ کی تائید حاصل ہے۔

تعجب ہے کہ جمعیت اقوام متحدہ کا مقرر کردہ غیر جانبدار کمیشن اپنی سرگرمیوں کی اطلاع برطانیہ اور امریکہ کو براہِ راست دے رہا ہے اور کیا عجب کہ اپنے اقدامات و تجاویز میں اس نے ہر دو ممالک یا کسی ایک سے استمداد و استصواب بھی کیا ہو۔ امریکہ اور برطانیہ کی دلچسپی سے یہ خدشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ دولِ عظمیٰ کی سیاست قوت کے گرداب میں آجائے گا اور اس کا تصفیہ حق و انصاف کی رو سے نہیں ہوگا بلکہ مخصوص سیاسی مصالح کے تقاضوں کا رہین منت ہوگا۔

یہ خدشہ ایک خبر سے حقیقی سا ہو گیا جو ان اپیلوں کے لگ بھگ دنیا بھر میں نشر ہوئی اور جس کا مفہوم یہ تھا کہ اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل کی ایک عارضی نشست کے لئے ہندوستان کو رکن منتخب کرایا جا رہا ہے۔ امریکہ کے تجارتی مفاد کی للچائی ہوئی نظریں ایک عرصہ سے ہندوستان پر ہیں۔ علاوہ ازیں کمیونزم کے خلاف جس عالمگیر محاذ کا امریکہ داعی ہے اور جس کی تعمیر و تشکیل میں وہ شبانہ روز مصروف رہتا ہے اس کے نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کو خصوصی اہمیت ہے۔ اس اہمیت کو چینی کمیونسٹوں کی فتوحات نے اور بڑھا دیا ہے۔ چین حفاظتی کونسل کا مستقل رکن ہے۔ اگر چین پر کمیونسٹ اقتدار ہو گیا تو ایک مستقل رکن روس کے حلقۂ اثر میں چلا جائے گا۔ اس احساسِ زیاں سے انگلستانی امریکی حلقوں میں نمایاں گھبراہٹ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ اس کوشش میں ہے کہ چین روسی حلقہ نفوذ میں چلا جائے تو اس کی مستقل رکنیت کسی اور ایسے ملک کو تفویض کر دی جائے جو امریکہ کی ہاں میں ہاں ملائے۔ یا اگر ایسا نہ ہو سکے تو ہندوستان پر احسانات کر کے اسے اس انداز سے آگے بڑھایا جائے کہ حفاظتی کونسل میں تو امریکہ کو ایک ووٹ حاصل رہے اور چین کے بعد ہندوستان کی زرخیز منڈی اس کے خصوصی قبضہ میں آجائے۔ چنانچہ اس سے پیشتر متعدد مرتبہ اس "خواہش" کا اظہار کیا گیا کہ جنوب مشرقی ایشیا کی قیادت ہندوستان کو تفویض ہونی چاہیے۔ چینی چیانگ کائی شک کی شکست کے بعد امریکہ نہرو کو روس کے خلاف دوسرا "چیانگ کائی شیک" بنانا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں امریکہ کی اس دلچسپی کے پیش نظر پاکستان انگلستانی امریکی حلقہ سے کسی ہمدردی اور تائید کی توقع نہیں کر سکتا۔

۲ ستمبر کو کراچی میں چودھری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ پاکستان نے اس کوشش پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے ایک اخباری بیان میں کہا:

ہم (حفاظتی کونسل کے لئے) ہندوستان کی امیدواری کا خیر مقدم کرتے بشرطیکہ کشمیر کا معاملہ حفاظتی کونسل کے روبرو پیش نہ ہوتا۔ . . . خود ہندوستان کے لئے مناسب اور آبرومندانہ رویہ یہی ہے کہ جب تک پاکستان اور ہندوستان کے مابین باہم مابہ النزاع مسئلہ موجود ہے وہ کونسل کی رکنیت کا امیدوار نہ بنے۔ . . . ہندوستان کا اس طرح پنچوں کی صف میں بیٹھنا، پاکستان کے نزدیک دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتا۔

بہرکیف پاکستان نے ۹ ستمبر کے مختصر مراسلہ میں ثالثی کی تجویز کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیا، لیکن ہندوستان نے ۱۸ ستمبر کے غیر ضروری طور پر طویل مراسلہ میں کشمیر کو قانونی اعتبار سے ہندوستان کا حصہ قرار دیتے ہوئے پاکستان پر ہندوستانی علاقہ پر حملہ کا الزام لگایا اور آزاد کشمیر کی افواج اور شمالی اضلاع سے متعلق ان اعتراضات کو دہرایا جس کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔ لاطائل دلیلوں اور دور از کار توجیہوں کے پیچاک میں معاملہ کو الجھاتے ہوئے ہندوستان نے ثالثی کی تجویز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ہندوستان نے ٹرومین اور اٹیلی کی اپیلوں کا بھی خیر مقدم نہ کیا اور انھیں قابل اعتراض سمجھتے ہوئے "مداخلت" سے تعبیر کیا۔ ۲۰ ستمبر کو الہ آباد میں اس "مداخلت" پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے نہرو نے دنیا کو "آئین و قانون" کا یوں درس دیا۔

کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے۔ اس پر "حملہ آوروں" نے حملہ کیا ہے، لہذا ہندوستان کے خلاف (پاکستان نے) جارحانہ اقدام کیا ہے۔ تمام دنیا کو یہ امر بخوبی اور مکمل طور پر سمجھ لینا چاہئے۔

چونکہ اس بیان میں اٹیلی اور ٹرومین کی اپیلوں کو "مداخلت" سے تعبیر کیا گیا تھا، اس لئے انگلستانی اخبارات میں بھی کچھ ہل چل مچی۔ انگلستان کے اخبار "مانچسٹر گارڈین" نے ۲۱ ستمبر کو ایک مقالہ میں نہرو سے پوچھا:

اگر کشمیر واقعی ہندوستان کا حصہ ہے تو ہندوستان نے کشمیر کمیشن کی قرارداد اگست کیوں قبول کی؟ تسلیم سے پیشتر تو نہرو ایسی دلیلیں دے سکتا تھا لیکن اب ان کا وقت گزر چکا ہے۔ . . . اگر ہندوستان اس پر تیار ہے کہ ریاست کشمیر کا مستقبل استصواب کے ذریعے طے ہو تو کیا یہ مناسب تھا کہ وہ کشمیری نمائندے ہندوستانی دستور ساز میں شریک کرتا؟ یا کیا یہ ضروری ہے کہ ذمہ دار ہندوستانی لیڈر ڈرامائی تقریروں میں ہندوستان اور کشمیر کے ناقابل شکست اتحاد پر زور دیں؟ . . . . . ہندوستان استصواب کو نظر انداز کر دینا چاہتا ہے حالانکہ استصواب کو تصفیہ کا ذریعہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ہندوستان استصواب کو بطائف الحیل ٹال رہا ہے۔ چنانچہ نہ تو اس نے

متارکہ سے متعلق مشترکہ کانفرنس کی تجویز منظور کی اور نہ ثالثی کی تجویز کو ہی تسلیم کیا۔ ہندوستان کی مصالحت دشمنی نے جب مفاہمت کے تمام دروازے مسدود کر دیئے تو کشمیر کمیشن مجبور ہو گیا کہ سارا معاملہ حفاظتی کونسل کے روبرو پیش کرے۔ چنانچہ ارکان کمیشن لیک سکسیس کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔

غلام کشمیر

ایک طرف ہندوستان دنیا کی آنکھوں میں یوں دھول جھونک رہا ہے اور دوسری طرف وادی کشمیر کے عوام گوناگوں صعوبتوں اور ناقابلِ یقین مصائب و نوازل کا شکار ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ہندوستانی فوج کے آہنی پردہ کے پیچھے سے باقاعدہ اور تفصیلی اطلاعات کا ملنا از قبیل محالات ہے تاہم جو مصیبت زدگان وہاں سے بھاگ کر آسکے ہیں یا جن کو آبائی گھروں سے نکلنے اور پاکستان کی طرف ہجرت کر جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے ان کی زبانی وادی کشمیر کی جہنم کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ کشمیر میں اشیائے خوردنی بالخصوص خوراک کی کمیابی اور گرانی ہے۔ جموں صوبہ کو خصوصیت سے مسلمانوں سے خالی کرایا جا رہا ہے اور یہ فریضہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے ہاتھوں سرانجام پا رہا ہے۔ خود عبداللہ نے اپنے ایک مضمون میں جو دہلی کے اخبار "انصاری" میں حال ہی میں شائع ہوا ہے سیوک سنگھ کی خونیں سرگرمیوں کا یوں اعتراف کیا ہے:

> جموں میں فتنہ پردازوں نے پرجا پریشد کے نام سے آفت مچا رکھی ہے۔ یہ دراصل وہی سنگھی ہیں جو گجرات کی خوں ریزیوں کے ذمہ دار تھے ..... ہم جب مہاتما گاندھی کی راکھ جموں لائے تھے تو انھوں نے جلوس پر پتھر برسائے تھے۔ جموں کی بدامنی میں انھوں نے ہزاروں معصوم بچے، عورتیں اور مرد قتل کئے۔ بے شمار مجبور و بے یار عورتوں کو اغوا کیا اور مسلمان قافلوں کو روک روک کر ذبح کیا۔ ... ان کی سفاکیوں کے تصور سے دل لرز جاتا ہے یہ لوگ پھر سے وہی خونی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان کی مشکلات

ہندوستان کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی ہے۔ کشمیر کی جنگ نے اس کے خزانہ پر گراں بہا بوجھ ڈالا ہے اور اس کی اقتصادی پریشانیوں میں چند در چند اضافہ کر دیا ہے۔ اشیائے صرف کی قیمتیں بڑھتی جا رہی ہیں، عوام کی قوتِ خرید کم ہوتی جا رہی ہے، متعدد کارخانے جن میں کپڑے اور شکر کے کارخانے شامل ہیں پیداوار کی مطلوبہ نکاسی نہ ہونے کے باعث بند ہو گئے ہیں، بیروزگاری بڑھتی جا رہی ہے۔ ان اقتصادی مشکلات نے عوام کو کانگرسی حکومت اور کانگرسی زعماء سے متنفر کر دیا ہے۔ جگہ جگہ کمیونسٹوں کے مظاہرے ہو رہے ہیں جن کا حکومت سے باقاعدہ تصادم ہوتا ہے اور نوبت قتل و خون تک پہنچ جاتی ہے۔

کمیونسٹوں کے مقابلہ کے لئے حکومت ہندوستان کو راشٹریہ سیوک سنگھ سے عاجلانہ مفاہمت

کرنا پڑی۔ ہر چند حکومت کا کہنا یہ تھا کہ سنگھ کی سرگرمیوں کو محدود کر دیا گیا ہے عملاً ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ خود سنگھ کے گرو گول والکر نے یہ واضح اعلان کیا کہ اس نے حکومت کی کوئی شرط تسلیم نہیں کی تو اس کی تردید کسی گوشے سے نہیں ہوئی۔ گول والکر کا سنگھ جن خطوط پر مصروف کار تھا انہی پر اب بھی جا رہا ہے۔ پاکستان کی مخالفت اس کا عقیدہ ہے۔ ۲۴ اگست کو گول والکر نے کہا کہ بھارت سے میری مراد غیر منقسم ہندوستان ہے، نیز بھارت کا ہر باشندہ تقسیم کو منسوخ دیکھنا چاہتا ہے۔

گول والکر مشرقی پنجاب کا بھی دورہ کرنے والا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سنگھ کو کمیونسٹوں اور سکھوں کے مقابلہ کے لئے آزاد کیا گیا ہے۔ ایک اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ گول والکر عنقریب پٹیل سے مل رہا ہے تاکہ کمیونسٹوں کے خلاف کانگرس سنگھ متحدہ محاذ قائم کیا جا سکے۔ لیکن سنگھ جیسی متشدد اور فسطائی جماعت کا سنبھالنا ہندوستان کے لئے مشکل ہو جائیگا۔ خود نہرو کو اس کا احساس ہے۔ ۵ اگست کو اس نے اعتراف کیا کہ صاف بات تو یہ ہے کہ ہم سنگھ پر اعتماد نہیں کر سکتے ہمیں اس پر کڑی نگرانی رکھنی ہوگی۔

ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان کے حالات بہتر اور زیادہ پرامن ہیں۔ یہ بہتری اور امن ہندوستان کی آرزوؤں کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ ہر ممکن کوشش کر رہا ہے کہ پاکستان کے حالات بہتر نہ ہوں۔ پچھلے دنوں ہندوستان کی مرکزی حکومت نے متروکہ جائدادوں سے متعلق جو آرڈیننس جاری کیا اور اس کی دیکھا دیکھی صوبائی حکومتوں نے جو غیر معمولی اختیارات اپنے ذمہ لئے ان کا بے محابہ استعمال شروع ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کو گھروں سے نکالا جا رہا ہے اور ان کی جائداد و مال کو مقسوم کیا جا رہا ہے۔ بنکوں کے حساب، کمپنیوں کے حصص غرض جائداد و دولت کا کوئی گوشہ ہندوستانی قوانین و حکام کی زد سے محفوظ نہیں۔ یہ کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ پاکستان جو مہاجرین کے سیلاب عظیم سے اب سنبھل رہا ہے پھر سے اسی گرداب ہلاکت میں ڈبو دیا جائے۔ چنانچہ بہار اور مغربی بنگال کے مسلمان بے دخل ہو ہو کر مشرقی بنگال پہنچ رہے ہیں اور دیگر گوشوں کے مظلومین مغربی پاکستان میں آ رہے ہیں۔ کشمیر سے بھی پناہ گزینوں کا از سر نو سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

اگست کے وسط میں عالمگیر بنک نے ہندوستان کی درخواست پر ۳۴ ملیون ڈالر قرضہ دینا منظور کیا ہے۔ یہ قرضہ سرکاری ریلوں کی تعمیر و ترقی کے لئے ہے۔ نہرو جیسا "اشتراکی" ان مشکلات سے عاجز آ کر امریکہ کی فراواں دولت پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہا ہے اور امریکی سرمایہ کو دعوت دے رہا ہے کہ وہ اس شکل میں ہندوستان کے کام آئے۔ آئندہ ماہ نہرو خود امریکہ جا رہا ہے۔ نہرو ان حرکات سے خود بخود ہندوستان کا چانگ کائی شک بنتا جا رہا ہے۔ چینی پیشرو کا حشر دنیا کے سامنے ہے!

اشتراکی گروہ جواب تک کانگرس کا موید رہا ہے اب کانگرس سے دور ہٹ چکا ہے اور اس سے مفاہمت پر رضامند نہیں۔ ۳۰ اگست کو جے پرکاش نرائن نے صاف کہدیا کہ حکومت اور مقننہ کا نظم ونسق جس انداز سے چل رہا ہے اس کے پیش نظر سوشلسٹ کانگرس سے اختلاط پیدا کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتے۔

مغربی بنگال میں سرت چندر بوس اپنی پارٹی کی تنظیم میں منہمک ہے اور جنوری میں ہونے والے صوبائی انتخابات کی تیاریوں میں سرگرم۔ اس نے جملہ سوشلسٹ گروہوں سے اپیل کی ہے کہ وہ متحدہ محاذ بنائیں۔ بوس نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ملک صحیح معنوں میں آزاد نہیں۔ کانگرس نے جو فریب وعدے عوام سے کئے تھے انہیں پورا نہیں کر سکی۔ ہر صوبے میں سیفٹی ایکٹ نافذ ہے اور نظام حکومت فاسد ہو چکا ہے۔ ایک ہی پارٹی کی حکومت ہے اور ایک ہی پارٹی کے فساد اور خویش نوازی کا دور دورہ ہے۔

خود مجلس دستور ساز میں بھی ایک حزب مخالف کی تشکیل ہو چکی ہے۔ اس کے قائد کے۔ ٹی۔ شاہ بمبئی کے مشہور ماہر اقتصادیات ہیں۔ اس پارٹی میں تین سابق کانگرسی اور پانچ مسلم لیگی بھی شامل ہیں۔ مزید ارکان کی شمولیت کی توقع کی جا رہی ہے۔

نہری پانی کی تقسیم

ریڈکلف کے بیرحم قلم کی ہلاکت بداماں جنبش سے پاکستان کو جن عظیم وجانکاہ حوادث سے دوچار ہونا پڑا وہ اظہر من الشمس ہیں، اسی دشمن انصاف کا ایک فتنہ پنجاب کی نہروں کا "مقتل" ہے جس سے مغربی پنجاب بیشتر نہروں کے سرچشموں سے محروم ہو گیا۔ خود ریڈکلف بھی اپنی ناانصافی کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے اس امید کا اظہار کیا کہ جہاں نہروں کی تقسیم ناگزیر ہو گئی ہے وہاں دونوں حکومتیں باہمی معاہدوں سے مناسب فیصلے کر لیں گی، لیکن اپنے آپ کو پانی کے ان سرچشموں کا "مالک" دیکھ کر ہندوستان کی رگ فتنہ پھڑکی اور اس نے گذشتہ سال مغربی پنجاب کو پانی دینا بند کر دیا۔ چنانچہ پانچ ہفتے پانی بند رہا۔ پنجاب کی زرخیزی دریاؤں اور ان سے نکالی ہوئی نہروں کی شرمندۂ احسان ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ظالمانہ فیصلے سے مغربی پنجاب کو کس قدر نقصان اٹھانا پڑا ہوگا۔ لیکن ہندوستان کے کلیجے کو اسی ابلیسی کارنامے سے ٹھنڈک حاصل ہوئی۔ گذشتہ سال کے مذاکرات باہمی سے ہندوستان صرف عارضی طور پر پانی کھولنے پر رضامند ہوا۔ امسال پھر یہی مسئلہ پیدا ہوا۔ چنانچہ نئی دہلی میں دونوں مستعمرات کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ دیگر مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی ہندوستان نے اپنی روایتی مصالحت ناپسندی کا ثبوت دیا اور اس بودے بہانے سے کہ مشرقی پنجاب کے مفاد کو شدید نقصان پہنچائے بغیر پاکستان کو پانی مہیا نہیں کیا جا سکتا، کسی قسم کی مصالحت سے انکار کر دیا۔

بین الاقوامی ضابطہ کی رو سے ہندوستان کو یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ پانی کے سرچشموں پر قابض ہو کر پاکستان کو یوں پانی سے محروم کر دے۔ خود یورپ کے مشہور دریا ڈینوب کی مثال موجود ہے جو کئی ممالک سے گزرتا ہے لیکن جسے بین الاقوامی گذرگاہ آب قرار دے کر ہر متعلقہ ملک کو حق تمتع دیا گیا ہے۔

پاکستان نے بالآخر ہندوستان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اس مسئلہ کو اقوام متحدہ کے سامنے یا بین الاقوامی عدالت میں پیش کیا جائے۔ لیکن ہندوستان کسی ایک تجویز پر بھی متفق نہیں ہو رہا۔ گو پاکستان نے اس سلسلہ میں کوئی ذمہ دارانہ بیان نہیں دیا تاہم قیاس کیا جاتا ہے کہ پاکستان از خود اس مسئلہ کو بین الاقوامی عدالت میں پیش کرے گا۔ ہندوستان اس ضد پر قائم ہے کہ پاکستان کو علیحدہ طور پر ان مسائل کو کسی بین الاقوامی ادارہ میں پیش کرنے کا حق نہیں۔ تعجب ہے کہ ابھی تک اس آبی کانفرنس کی تفصیلات سرکاری طور پر شائع نہیں ہوئیں۔

بھارت ہندوستان کی مجلس دستور ساز نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک کا نام اندرون ملک تو بھارت ہو اور بیرون ملک انڈیا۔ انگریزی میں اسے انڈیا ہی لکھا جائے گا۔ نہرو کی نام نہاد غیر مذہبی حکومت دن بدن کٹر ہندوانہ حکومت کے روپ میں ظاہر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا مزید ثبوت اگر ثبوت کی گنجائش اب تک باقی ہے تو یہ ہے کہ بھارت کی دستوریہ نے بھارتی زبان سے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہندی ہو جو صرف دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے۔ یہ فیصلہ کانگرس کی اس واضح حکمت عملی کی صریح خلاف ورزی ہے جسے کانگرس کے مہاتما۔ گاندھی۔ نے وضع کیا تھا۔ اب تک کانگرس کی سرکاری حکمت عملی یہی رہی ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی جسے اردو اور دیوناگری دونوں رسوم الخط میں لکھا جائے گا۔ لیکن رجعت پسند ہندویت نے بالآخر اس حکمت عملی کی تغلیط کر دی اور جب سرکاری طور پر اسے قانونی شکل دینے کا وقت آیا تو دیوناگری رسم الخط اور ہندی زبان کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا گیا۔ ابوالکلام جیسا متشدد کانگرسی بھی اس فیصلہ کو دیکھ کر یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ زبان کے مسئلہ پر غیر روادارانہ اور فرقہ دارانہ نقطۂ نگاہ سے غور کیا گیا ہے۔ یوپی کے مشہور لیڈر مسٹر لاری نے اس فیصلہ کے خلاف احتجاج کے طور پر دستوریہ سے استعفا دیدیا ہے۔ لاری کا احتجاج بجا لیکن استعفا دینے سے بہتر یہ رہتا کہ دستوریہ کے حزب اختلاف کو مستحکم کیا جائے جسے حال ہی میں بعض ارکان دستوریہ نے مرتب کیا ہے اور جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

انصاف کا خون سید قاسم رضوی، قائد رضاکاران حیدرآباد (دکن) جو سقوط حیدرآباد کے وقت سے ہندوستانی فوجی گرفت میں تھے، ان کے خلاف بالآخر ہندوستان نے مقدمہ چلا کر دل کی بھڑاس نکالنے اور انصاف کی مٹی پلید کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ رضوی کا گناہِ عظیم دنیا جانتی ہے اس نے حیدرآباد کی آزادی کو برقرار رکھنا چاہا۔ لیکن ہندوستان نے ان پر شعیب اللہ، مدیر روزنامہ امروز، حیدرآباد کے قتل میں امداد دینے کا الزام لگایا ہے اور یہی مقدمہ اب عدالت خصوصی میں چل رہا ہے۔ ہندوستانی وکلاء سے کسی قسم کی توقع نہ رکھتے ہوئے سید رضوی کے لئے دو انگریز بیرسٹروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جب دونوں حیدرآباد پہنچے اور انھوں نے دستور کے مطابق وکالت کی اجازت چاہی تو عدالت نے مطلوبہ اجازت دینے سے بدیں عذر لنگ انکار کر دیا کہ وہ صاحب حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو نہیں جانتے۔ یہ بہانہ لچر اور طفلانہ ہے، کیونکہ اول تو قانون وقت ایسی پابندی روا نہیں رکھتا دوسرے خود جج اردو سے نابلد محض ہے۔ انگریز بیرسٹر نے جب یہ جوابی دلیل دی تو اسے شائستہ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ جب خود مجرم منصف بن جائے تو انصاف کا ایسے ہی بے دریغ خون ہوتا ہے۔!

پاکستان

ردِ عمل ہندوستان جس بے دریغی اور بے رحمی سے مسلمانانِ ہندوستان کی جائدادوں کو ختم کر رہا ہے اس کے جواب میں پاکستان کو بھی ایک آرڈیننس نافذ کرنا پڑا جس کی رو سے متروکہ جائدادوں کی خرید و فروخت ممنوع قرار دیدی گئی۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ پاکستان نے اس آرڈیننس کی ضرورت محسوس کی۔ عملاً جائدادوں کو ختم کرنے کی رفتار کافی سست ہے۔ کراچی کے حکام نے اس سست رفتاری کے لئے عملہ کی کمی ذمہ دار ٹھہرایا ہے لیکن ایسے اہم کام کیلئے یہ عذر معقول نہیں ہو سکتا۔

اس آرڈیننس کا نفاذ مشرقی پاکستان میں ابھی تک نہیں کیا گیا لیکن مطالبہ ہو رہا ہے کہ اسے فی الفور وہاں بھی نافذ کیا جائے۔

تجارتی حلقوں نے بھی ہندوستان کے اس ظالمانہ رویے کے خلاف احتجاج ضروری سمجھا ہے۔ چنانچہ ۴ اگست کو کراچی کے تھوک فروش بزازوں کی انجمن نے ہندوستانی کپڑے کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس انجمن نے حکومت پاکستان سے درخواست کی ہے کہ وہ حالیہ مستعمراتی تجارتی معاہدہ

کی پابندی نہ کرے۔ انجمن کی مجلس عمل عنقریب وزیر تجارت سے ملاقات کر رہی ہے تاکہ اپنا نقطۂ نگاہ حکومت پر واضح کرے۔

ریاستیں

ریاستوں کے متعلق پاکستان کی حکمت عملی ایک حد تک سابق آل انڈیا مسلم لیگ کی روش "عدم مداخلت" کا آئینہ معلوم دیتی ہے۔ مرکزی حکومت نے ابھی تک جرأت اور دلیری سے نوابوں کے آمرانہ اور غیر جمہوری طرز حکومت کو جمہوری یا آئینی بنانے اور اس میں عوام کو شریک کرنے کی قابل قدر کوشش نہیں کی۔ ریاستی کاروبار حکومت غیر جمہوری ہی نہیں، وہ غیر آئینی بلکہ استبدادی ہے۔ خصوصیت سے شمال مغربی سرحد پر واقع ریاستوں سے آئے دن جور و استبداد کی تشویشناک خبریں آتی رہتی ہیں۔ معاملہ کی نوعیت اب یہ ہو چکی ہے کہ ان پاکستانی ریاستوں کے باشندے ظلم و جور سے تنگ آکر ریاستوں سے بھاگ بھاگ کر پاکستان میں آرہے ہیں اور مطالبہ کر رہے ہیں کہ حکومت پاکستان کو ان ریاستوں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لینی چاہیئے۔ ان دنوں ریاست پھلرہ کا نام خصوصیت سے اخبارات میں آرہا ہے۔ اس کے بد قسمت مہاجرین صوبہ سرحد کی وزارت کو دہائی دے رہے ہیں کہ وہ ریاستی حکومت کو اپنے قبضہ میں کرلے۔

حکومت پاکستان کو چاہیئے کہ وہاں زیادتیوں کی تفتیش کرے اور نوابوں کی استبدادیت کم کرنے اور عوام کا معیار زیست بلند کرنے کے لئے مناسب، موثر اور فوری اقدامات کرے۔

ریاست خیرپور نے حکومت پاکستان کی منظوری سے ۷ر اگست کو اصلاحات کا اعلان کیا ہے۔ حکومت کو جمہوری بنانے کے لئے ایک مجلس مقننہ تشکیل دی جائے گی جو ۱۵، منتخب ارکان پر مشتمل ہوگی۔ ان میں سے ایک نشست حکمران خاندان کے فرد کے لئے مخصوص ہوگی اور بذریعہ انتخاب پر ہوگی۔ انتخاب مخلوط ہوگا اور اس کی اساس بالغ رائے دہندگی ہوگی۔

مجلس مقننہ کے صدر کا تقرر پہلے چار سال کے لئے دربار کرے گا۔ مقننہ کے علاوہ ایک مجلس وزراء ہوگی۔ کم از کم آدھے وزیر منتخب ارکان میں سے لئے جائیں گے۔ وزیر اعظم کا تقرر نواب حکومت پاکستان کی منظوری سے کریگا، وزراء کا تقرر نواب وزیر اعظم کے مشورہ سے کریگا۔

ریاست کا الحاق چونکہ پاکستان سے ہے، اس لئے الحاق کی شرط کے مطابق مواصلات، دفاع اور امور خارجہ تو مرکزی حکومت پاکستان کے سپرد ہوں گے۔ مالیات سے متعلق اعلان میں ذکر نہیں۔ البتہ بعض دیگر اہم شعبے مثلاً، لوکل سیلف گورنمنٹ، صنعت، رسل و رسائل، سول سپلائی۔ غذا، صحت، تعلیم وغیرہ وزراء کے سپرد ہوں گے۔

اصلاحات کی یہ قسط ناکافی ہے اور ان کی رفتار تیز تر ہونی چاہیئے، اور ریاستوں کا درجہ

صوبوں کے برابر ہو جانا چاہیئے، تاہم یہ غنیمت ہے کہ ریاستی حکمران اصلاحات کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے آہستہ خرامی سے ہی سہی، اس منزل کی جانب چلے ضرور آ رہے ہیں۔

مرکزی حکومت مرکزی حکومت میں حال ہی میں مزید توسیع کی گئی ہے اور مندرجہ ذیل نئے وزراء کا تقرر ہوا ہے:

۱۔ سردار بہادر خاں (صوبہ سرحد) جو پہلے دفاع کے نائب وزیر تھے اور جنہیں سردار عبدالرب نشتر، سابق وزیر مواصلات کے گورنر پنجاب مقرر ہو جانے پر مواصلات کا شعبہ عارضی طور پر دیدیا گیا تھا، اب باقاعدہ وزیر بن گئے ہیں اور مواصلات کے منصرم۔

۲۔ چوہدری نذیر احمد (مغربی پنجاب) کو جو مجلس دستور ساز کے رکن تھے، نئے وزیر مقرر کیا گیا ہے اور شعبہ صنعت ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر اے۔ ایم۔ ملک (مشرقی بنگال) کو صحت اور تعمیرات کا وزیر مقرر کیا گیا ہے۔

۴۔ سردار محمد نواز خاں (مغربی پنجاب) کو محکمہ امور خارجہ اور روابط دولت مشترکہ کا نائب وزیر مقرر کیا گیا ہے۔

بلوچستان قاضی عیسیٰ، مشیر اعظم، سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے باوصف مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی نہیں ہوئے، حالانکہ خود مسلم لیگ کے اپنے فیصلے کے مطابق وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ مشاورتی کونسل کے دس ارکان نے ۲ راگست کو ان سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلم لیگ کی صوبائی وزارت سے مستعفی ہو جائیں۔ مشاورتی کونسل کے باہر یہ مطالبہ اس سے پہلے ہو چکا ہے۔

۸ راگست کی اطلاع ہے کہ گورنر جنرل کے بلوچستانی ایجنٹ نے احکام صادر کر دیئے ہیں کہ مشاورتی کونسل کے لئے عنقریب انتخابات برپا ہوں گے جن کی اساس بالغ رائے دہندگی ہوگی۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ارکان کونسل کی موجودہ تعداد بڑھا دی جائیگی۔ انتخابات مارچ ۱۹۵۰ء سے پہلے نہیں ہو سکیں گے۔

انتخابات کے فیصلہ نے مسلم لیگ اور اس کی حریف قبائلی فیڈریشن میں "بیداری" کے آثار پیدا کر دیئے ہیں اور دونوں نے تفوق ذات کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے ہیں۔

سندھ سندھ کے مسٹر ہاشم گذدر جس سندھ کنونشن کی تیاریاں کر رہے تھے وہ کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دی گئی ہے۔ مسلم لیگ نے اس اقدام کی مذمت کی ہے لیکن گذدر صاحب کا کہنا ہے کہ صوبائی لیگ کے ذمہ دار ارکان یا ان میں سے بعض اس کنونشن کے انعقاد کے حامی تھے لیکن بعد میں، غالباً مرکزی لیگ کا اشارہ پا کر اپنی سابقہ روش سے منحرف ہو گئے ہیں۔

اس صوبہ میں مسلم لیگ کی سیاست نے دلچسپ پلٹا کھایا ہے جو بعض کے نزدیک حیران کن ہوسکتا ہے مگر غیر متوقع نہیں۔ صوبہ کے معزول وزیر اعظم مسٹر کھوڑو نے جس ڈرامائی انداز سے صوبائی لیگ کی صدارت پر قبضہ کیا تھا اور پھر استعفیٰ دیدیا تھا، اس مسخرگی کا ایک اور مظاہرہ انھوں نے فرمایا ۲۶ اگست کو صوبائی لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس مستعفی صدر کھوڑو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کہا گیا ہے کہ مسٹر کھوڑو نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا ہے۔ مجلس عاملہ نے کھوڑو کی صدارت میں یہ فیصلہ کیا کہ صدر صاحب کو پبلک لائف سے تین سال کی محرومی کی جو سزا دی گئی ہے اسے منسوخ کرایا جائے۔

۲۹ اگست کو صوبائی لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ کونسل نے ایک قرارداد میں حکومت پاکستان سے اپیل کی کہ وہ کھوڑو پر سے مذکورہ بالا پابندی اٹھالے۔

کونسل میں وزیر اعظم یوسف ہارون نے اپنی وزارت کے کارناموں کی داستان سنائی اور صدر کھوڑو نے ان کارناموں پر سند قبولیت عطا کی۔

مسٹر کھوڑو کی مراجعت فرمائی صوبائی سیاست تک ہی محدود نہیں بلکہ مرکزی مسلم لیگ نے بھی کھلی آغوش سے ان کا "استقبال" کیا۔ ۲۹ اگست کو پاکستان مسلم لیگ کونسل کا جو اجلاس کراچی میں منعقد ہوا اس میں کھوڑو کو خصوصی دعوت دیکر شریک کیا گیا۔ جس شخص کو حکومت تین سال کیلئے پبلک لائف سے محروم کردینا ضروری سمجھتی ہے اس شخص کو حکومت مرتب کرنے والی جماعت یعنی مسلم لیگ اپنے مشوروں میں خصوصی دعوت دے کر شریک کرتی ہے!

مغربی پنجاب ہر چند صوبہ کا انصرام ایک پاکستانی بلکہ لیگی گورنر کے سپرد ہوگیا ہے لیکن مسلم لیگ سے ابھی تک مشیروں کا مسئلہ طے نہیں ہوسکا۔ بظاہر پاکستانی گورنر کے تقرر کے بعد مشیروں کے تقرر کا سوال ختم ہوجانا چاہئے تھا لیکن ہوسِ جاہ کی بے پناہی نے اس قضیہ کو ختم نہیں ہونے دیا۔ ۲۲ اگست کو محترم لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان لاہور تشریف لیگئے۔ ۲۳ اگست کی وزیر اعظم اور گورنر اور صدر مسلم لیگ کی باہمی ملاقاتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۲۴ اگست کو مولوی باری نے گورنر کو ۲۱ مشیروں کی فہرست کی "سلامی" دی۔ چونکہ صدر صاحب کے لئے کسی کا نام مسترد کرکے اسے ناراض کردینا آسان نہیں تھا اس لئے پانچ اسامیوں کے لئے اکیس نام دیئے گئے اور انتخاب کی ذمہ داری گورنر پر ڈال دی گئی۔ توقع تھی کہ وزیر اعظم پاکستان کی تشریف آوری اور موجودگی سے یہ مرحلہ بالآخر طے ہوجائیگا۔ لیکن ۲۷ اگست کو صوبائی لیگ کونسل کے ۸۰ ارکان نے کونسل کا اجلاس طلب کرنے کی تحریک کردی تاکہ مشیروں کے تقرر کے مسئلہ پر بدلے ہوئے حالات میں ازسرِ نو غور کیا جاسکے، ان کی رائے میں اب مشیروں کی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ ۲۷ اگست کی صبح کو وزیر اعظم پاکستان لاہور سے

عازم کراچی ہو گئے اور مشیروں کا معاملہ ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔

مغربی پنجاب کی مجلس مقننہ کے انتخابات آئندہ سال موسم بہار میں ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی صوبہ بھر میں لوکل باڈیوں کے انتخابات بھی ہو رہے ہیں۔ آنے والے انتخابات نے صوبہ میں ہل چل پیدا کر دی ہے اور جاہ و منصب کے دلدادگان بھیس بدل بدل کر میدان سیاست میں آ رہے ہیں۔ مسلم لیگ بہ حیثیت جماعت اپنا وقار اور اعتماد کھو چکی ہے۔ اس کی سیاست کی یہ حالت ہے کہ ۱۱ اگست کو صوبائی لیگ کونسل نے یہ فیصلہ تو کر دیا کہ پارلیمنٹری بورڈ کے ارکان کی تعداد ۷ سے ۹ ہو جائے لیکن اس کے انتخاب کے طریق کار تک پر مفاہمت نہ ہو سکی۔ چنانچہ ابھی تک کوئی پارلیمنٹری بورڈ معرض وجود میں نہیں آ سکا۔ اس کے باوجود وہ اسمبلی اور لوکل باڈیز کے انتخابات میں حصہ لے رہی ہے۔

اس افراتفری میں عوام کا، کہ مطلوبہ شعور نہیں رکھتے، کیا حشر ہوگا؟ کیا ان حالات میں منتخب ہونے والی اسمبلی بدقسمت صوبے کے مصائب کا مداوا ہو سکے گی؟ دیدہ باید!

مشرقی بنگال صوبہ کی غذائی حالت ابھی تک اطمینان بخش نہیں ہو سکی۔ اجناس کی قیمتیں کم ضرور ہو گئی ہیں، تاہم معمول سے زیادہ ہیں۔ اگست کے اوائل میں کراچی میں مرکزی حکومت نے ایک کانفرنس طلب کی اور ان امور پر غور کیا کہ کس طرح صوبہ کو زیادہ سے زیادہ غذائی اجناس پہنچائی جائیں اور رسل و رسائل کی مشکلات کو دور کیا جائے تاکہ خوراک ہر جگہ آسانی سے پہنچ سکے۔

مشرقی بنگال کی اسمبلی نے ۴۵، ارکان کی جو کمیٹی اس مقصد بنائی تھی کہ تنسیخ زمینداری سے متعلق مسودہ قانون پر نظر ثانی کرے، اس نے ۴ اگست کو اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ یہ رپورٹ اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں بحث کے لئے پیش ہوگی۔ اس کمیٹی کی سفارشات کے مطابق زمینداری کی تنسیخ تدریجی ہوگی جو ۴۹ سال میں مکمل ہوگی۔ متعلقہ کاغذات کی تیاری پر دس سال صرف ہوں گے۔ زمینداروں کو تیس کروڑ معاوضہ ادا کیا جائیگا۔ حکومت کو ۲ کروڑ ۱۴ لاکھ روپیہ سالانہ زائد آمدنی ہوگی۔ حالات کے دباؤ میں اور واقعات کی منطق کے سامنے تنسیخ زمینداری کا اصول تو عموماً مسلمہ ہو گیا ہے لیکن جس انداز اور رفتار سے اسے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے وہ مایوس کن ہے۔

مالیات پاکستان اور برطانیہ کے مابین ۵ اگست کو لندن میں ایک مالی معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدہ کی رو سے پاکستان سٹرلنگ حلقہ کا مکمل رکن بن گیا ہے۔ ایک سال میں یعنی ۳۰ جون ۱۹۵۰ء تک پاکستان اپنے سٹرلنگ اندوختہ سے گذشتہ سال کے مقابلہ میں ڈھائی گنا زیادہ رقم نکلوا سکے گا۔ گذشتہ سال کل رقم ۵ ملیون سٹرلنگ (۲۰ ملیون ڈالر) تھی۔ امسال یہ رقم ۱۲ ملیون سٹرلنگ (۴۸ ملیون ڈالر) ہوگی۔ گذشتہ سال کی طرح پاکستان ۵ ملیون سٹرلنگ زائد رقم بھی حاصل کر سکے گا۔ خوراک کے

سلسلہ میں اگر پاکستان کو غیر معمولی درآمد کرنا پڑی تو اس غیر معمولی خرچ کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ آئندہ سال کی رقوم کے لئے ۳۰ جون سے پہلے پہلے گفتگو کی جائے گی۔

لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے خزانہ نے فیصلہ کیا تھا کہ انگلستان جس ڈالری بحران سے دوچار ہے اس کے پیش نظر ڈالر حلقہ سے درآمد کم کردی جائے تاکہ انگلستان کے پاس ڈالر مطلوبہ مقدار میں جمع ہوسکیں اور جمع رہیں۔ پاکستان زرعی ملک ہے اور اسے زراعت کی ترقی اور صنعت کی ترویج کے لئے کثیر تعداد میں مشینوں کی ضرورت ہے۔ مشین ڈالر حلقہ سے یعنی امریکہ سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ ڈالر حلقہ سے درآمد کم نہ کی جائے، لیکن دولت مشترکہ کے مشترکہ مفاد کیلئے پاکستان نے اپنا نقطۂ نگاہ واضح کرتے ہوئے اور اچھی طرح جتاتے ہوئے کہ اسے مشینوں کی کم درآمد کی شکل میں جو نقصان ہوگا اس کا دولت مشترکہ خصوصیت سے لحاظ رکھے گی اور اس کمی کو حتی الوسع پورا کرنے کی کوشش کرے گی، یہ پابندی قبول کرلی۔

غیر ملکی سرمایہ

پاکستان میں زرعی اور صنعتی ترقی کے لئے مشینوں کی فوری ضرورت ہے۔ پاکستان کا سرمایہ دار طبقہ فوری منافع کا اس قدر دلدادہ ہے کہ وہ کسی صنعت میں سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہیں ہو رہا، کیونکہ اس طرح اسے منافع حاصل کرنے کیلئے برسوں انتظار کرنا پڑیگا۔ حالانکہ پاکستان کی اقتصادی ترقی صنعتی فروغ میں مضمر ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ملک میں سرمایہ کی کمی ہے یا سرمایہ عاجلانہ جلب منفعت کے باعث صنعت پر تجارت کو ترجیح دے رہا ہے۔ وزیراعظم پاکستان نے ۷ ستمبر کو صنعتی مشاورتی کونسل کا افتتاح کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ ملک میں مطلوبہ صنعتی ترقی کے لئے کافی سرمایہ موجود ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق حکومت کے ماہرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ بظاہر یہ نتیجہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابھی تک بہت کم صنعتی ادارے معرض تشکیل میں آسکے ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ حکومت نے کن ذرائع اور کن اساسات کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے، لیکن ایک بات خصوصیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ بڑے سرمایہ کی کمپنیوں کی طرف مناسب توجہ نہیں ہوئی بایں ہمہ حکومت نے جب بھی سرمائے کا مطالبہ کیا ہے ملک کا جواب فراخدلانہ ہوا ہے اب تک جن جن مدات کے لئے حکومت نے قرضے لئے ہیں یا سرمایہ فراہم کیا ہے ان میں سے بیشتر کے لئے چند گھنٹوں میں مطلوبہ سرمایہ بہم پہنچ گیا، یہاں تک کہ حکومت کو وہ مدات بند کرنا پڑیں۔ یہ اہم اور خوش آئند علامت ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ملکی سرمایہ انفرادی سرمایہ داروں پر مناسب اعتماد نہیں رکھتا بلکہ حکومت کی ساکھ مضبوط ہے۔ ایسے میں توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر حکومت صنعتی ترویج کا کام انفرادی سرمایہ داروں کے ذمے چھوڑنے کی بجائے از خود سنبھال لے اور ابتدا سے ہی قومی خطوط پر کارخانے

کھولے اور صنعتیں رائج کرے تو مطلوبہ سرمایہ بہم پہنچ جائے گا۔ محولہ بالا تقریر میں وزیر اعظم نے خرچ کا تخمینہ یہ بتایا ہے کہ آئندہ دس سال میں پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے تین سو کروڑ روپیہ درکار ہوگا۔ گو یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ملک کتنا سرمایہ مہیا کر سکے گا لیکن اگر سرمایہ کی فراہمی کے لئے حکومت اپنی ضمانت پر سرگرمی سے کوشش کرے تو موجود سرمایہ میں سے زیادہ سے زیادہ صنعتی ترقی کے کام آسکتا ہے۔

غیر ملکی سرمایہ اپنے ساتھ لازماً سیاسی اثر و نفوذ بھی لاتا ہے۔ ایک مرتبہ غیر ملکی سرمایہ کا سیلاب شروع ہو گیا تو خدشہ ہو سکتا ہے کہ اس اقتصادی گرداب سے بچ نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مناسب قوانین اور شرائط سے اس کا بہت حد تک تحفظ کیا جا سکتا ہے لیکن ملکی سرمایہ کو غیر ملکی سرمایہ پر بہر صورت ترجیح دینی چاہئے۔

الغرض معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے تہیہ کر لیا ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کے لئے دروازہ زیادہ سے زیادہ کھلا رکھا جائے۔ محولہ بالا تقریر میں محترم لیاقت علی خاں نے فرمایا کہ بیرون پاکستان ایسی فضا پیدا کی جا رہی ہے کہ غیر ملکی سرمایہ دار جن پابندیوں کے باعث پاکستان میں کافی سرمایہ نہیں لگا رہے وہ دور کر دی جائیں۔ ۱۶ ستمبر کو پاکستانی وفد اور برطانوی حکومت کے مذاکرات سے جو فیصلہ ہوا اس کی رو سے سال بھر میں دس لاکھ پونڈ تک سٹرلنگ آزادانہ پاکستان میں آسکے گا۔ گویا اس قدر رقم پاکستان کے آزاد سٹرلنگ حصہ میں سے وضع نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے زائد ہوگی۔ گذشتہ سال کے معاہدہ میں کل رقم چھ لاکھ پونڈ سالانہ تھی جس کی ایک تہائی حکومت پاکستان کے آزاد سٹرلنگ حصہ (Free Sterling available to Pakistan Govt:) کے حساب میں شمار ہوتی تھی۔

مسٹر فضل الرحمان وزیر صنعت نے ۷ ستمبر کو ایک تقریر میں انکشاف کیا کہ حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک انڈسٹریل پروموشن کارپوریشن (ادارہ ترویج صنعت) قائم کیا جائے جو عظیم اور متوسط صنعتوں کو رائج کرے۔ اس کیلئے کل ۳۳۵ کروڑ روپے درکار ہوں گے۔

مسلم ممالک

بدخواہ ہمسایہ

پاکستان اور افغانستان کے حادثہ مغل زئی کی جو تحقیقات مشترکہ طور پر کی تھی اس میں یہ ثابت ہوا کہ مغل زئی پر بمباری پاکستانی ہوا باز کی غیر ارادی غلطی سے ہوئی اور پاکستان کی حکومت یا حکام اس سے بری الذمہ ہیں۔ پاکستان نے یہ بھی تسلیم کیا کہ بم باری سے ۲۳۔ آدمی ہلاک ہوئے، ایک لاپتہ اور ۲۴ زخمی۔ پاکستان نے تاوان دینا بھی منظور

کرلیا ہے۔ تاوان کا تعین افغانستان کی منشا کے مطابق بعد میں ہوگا۔

اس قضیہ سے متعلق اس طرح باہمی مفاہمت سے توقع ہو چلی تھی کہ افغانستان اب باہمی اختلافات کو مذاکرات سے ہی سلجھائے گا اور پاکستان کے خلاف غیر دانشمندانہ اور غیر آبرومندانہ غوغا آرائی بند کردے گا۔ مگر اس کے لب و لہجہ میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔ ریڈیو اور اخبارات بدستور ہرزہ سرائی میں مصروف ہیں۔ مثلاً اخبار "انیس" نے ۲۴ راگست کو جشنِ آزادی کے موقع پر اس بے جا تعلّی کا مظاہرہ کیا:

یہ وہی قومیں ہیں جنہوں نے (دھل میں) ۱۹۱۹ء میں دشمن کے متعدد مقامات غارت کئے اور

بعینہٖ اسی جگہ برطانوی صفوں میں تباہی مچادی جسے آج پاکستان اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا ہے۔

شاہ افغانستان، ظاہر شاہ اور سردار شاہ محمود نے اپنی تقریروں میں نام نہاد پٹھانستان کی موہوم آزادی کی جنگ کا ذکر کیا اور کہا کہ آئندہ جشن پٹھانستان کی آزادی سے متعلق اضطراب سے پاک ہوگا۔

ستمبر کے پہلے ہفتہ میں فیض محمد خان، لندن کا افغانی سفیر کابل واپس آیا۔ اس کے آتے ہی شاہی خاندان پاکستان سے تعلقات پر غور کرے گا۔

پاکستان نے اب تک افغانستان کے معاملہ میں دوستانہ رویہ رکھا اور اس کی زہر چکانیوں پر خاموش رہا لیکن افغانستان کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر پاکستان شاید اپنے رویہ پر نظرِ ثانی کرنے لگا ہے۔ پاکستانی وزیر متعینہ کابل کو ستمبر میں کراچی بلایا گیا۔ وزارتِ خارجہ کی گفتگوؤں سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ پاکستان اپنے رویۂ "تالیف" پر بالآخر نظرِ ثانی کرے گا۔

عام طور پر کہا جاتا تھا کہ افغانستان یہ غیر شریفانہ حرکات خواہ مخواہ نہیں کر رہا بلکہ وہ ملک کی اقتصادی پریشانیوں سے عاجز آکر ایسا کر رہا ہے۔ ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں افغانستان کے وزیر اقتصادیات نے آخرکار تسلیم کیا کہ ملک شدید اقتصادی بحران سے دوچار ہے۔ کاش افغانستان یہ سمجھ سکے کہ اقتصادی مصائب کا حل اپنے سے خوشحال تر ہمسایوں کو گالیاں دینے میں نہیں بلکہ مصائب کے براہِ راست ازالے کے عزمِ راسخ اور سعیٔ خالص ہی میں ہے۔

فلسطین

لوزان کانفرنس نے جو اقوامِ متحدہ کے مصالحتی کمیشن کی زیرِ نگرانی عرب اور اسرائیلی نمائندوں میں ہو رہی ہے اور جس میں اہم متنازعہ فیہ مسئلہ عرب مہاجرین کی اپنے اصلی گھروں میں واپسی اور بحالی کا ہے، ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ کوئی تین ماہ کی مساعی کے بعد ۲۰ جولائی کو یہ توقع پیدا ہوئی کہ عرب شاید اس نئی اسرائیلی پیشکش کو قبول کرلیں کہ وہ "قابلِ قدر" عربی مہاجرین واپس لے لیں گے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اسرائیلی حکومت ایک لاکھ عرب مہاجرین کو واپس لینے اور اپنی حدود میں آباد کرنے پر آمادہ ہو سکے گی۔ ۲ راگست کو اسرائیلی پارلیمان میں وزیرِ خارجہ

بتایا کہ وہ امریکہ کے دباؤ میں ایک لاکھ عرب مہاجرین واپس لے رہے ہیں۔ اس نے مزید کہا کہ اگر ایک لاکھ عرب اور واپس آگئے تو ہماری حکومت میں کل عرب ڈھائی لاکھ ہو جائیں گے، کیونکہ ڈیڑھ لاکھ کے قریب پہلے سے ہی موجود ہیں۔

۳۰ اگست کو عربی نمائندوں نے یہ مطالبہ بھی پیش کیا کہ عرب مہاجرین کی آبادی کیلئے عربوں کو مزید علاقہ دیا جائے۔ لاکھوں عرب جنہیں یہودی علاقہ سے گھر بار چھوڑ کر بھاگنا پڑا گوناگوں مصائب میں مبتلا ہیں۔ ابھی تک ان کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا، کیونکہ عربی حکومتیں ناکافی ذرائع اور باہمی رقابتوں کے باعث ایسا کرنے سے قاصر ہیں۔ عربی نمائندے اب تک اسی مطالبہ پر اڑے ہوئے ہیں کہ اسرائیلی حکومت ان مہاجرین کو واپس لے لے۔ اس مشکل کے "مستقل" حل کی ایک نئی تجویز یہ پیش ہوئی ہے کہ مشرق وسطیٰ کا اقتصادی جائزہ لیا جائے، تاکہ اسرائیل اور عرب ممالک میں جلد مفاہمت ہو سکے۔ اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل سے اس ضمن میں استمداد کی گئی ہے اور خیال ہے کہ امریکہ کی قیادت میں چالیس ماہرین عنقریب مشورہ کیلئے لوزان پہنچ رہے ہیں۔ مشورہ کے بعد وہ مشرق وسطیٰ کا دورہ کریں گے۔

عربوں اور یہودیوں میں دوسرا اہم اختلاف یروشلم کی آئندہ حیثیت سے متعلق ہے۔ اب تک تجویز یہ ہے کہ یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دیا جائے لیکن یہودی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ فلسطین سے متعلق مصالحتی مذاکرات کا مرکز اب لوزان سے ایک سکیشن منتقل ہو رہا ہے، جہاں جنرل اسمبلی کے انعقاد کے دوران میں مصالحتی مساعی کو جاری رکھا جائیگا۔ یوں بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ فلسطین کا مسئلہ پھر سے اقوام متحدہ کے روبرو پیش کیا جائے۔

عربی سیاست

مارچ کے اواخر میں جو "پرامن" انقلاب شام میں وقوع پذیر ہوا تھا اور جس کے حقیقی خدوخال کچھ ابھرنے شروع ہو رہے تھے، چنداں دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ ۱۳ اگست کو وہاں ایک اور "انقلاب" ہوا۔ یہ انقلاب بھی سابقہ انقلاب کی طرح ایک فوجی افسر کا لایا ہوا ہے۔ کرنل سامی حناوی نے حسنی الزعیم کو قتل کر دیا اور خود اقتدار سنبھال لیا۔ حسنی الزعیم نے اقتدار سنبھالتے ہی اعلان کیا تھا کہ وہ مناسب فضا پیدا کرنے کے بعد جمہوریت قائم کریگا اور اہل ہاتھوں میں اقتدار منتقل کر دے گا۔ لیکن اس نے انتخابات کا جو ڈھونگ رچایا اس سے اپنے لئے راستہ صاف کیا اور بالآخر وہ آمر کی حیثیت سے شام پر مسلط ہو گیا۔ حناوی کے عزائم کو جانچنے کیلئے کچھ وقت درکار ہوگا۔ بہرحال فوج کی یہ ہنگامہ آفرینی اور ملکی سیاست میں بے پناہ مداخلت تشویشناک ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ فوجی انقلابیوں کا یہ سلسلہ کہاں منتہی ہوگا!

عرب حکمرانوں کی باہمی رقابتوں کے باعث فلسطین میں ان کی ناکامی نے عربوں میں عام اضطراب پیدا

کر دیا ہے۔ مزید براں عرب ممالک میں وہ جمہوری اور آئینی ادارے مفقود ہیں جو جمہور کو شریک حکم بنانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ان پر مستزاد دولِ عظمیٰ کی سیاست ہے۔ عربی ممالک کا تیل اور سیاسی اہمیت عربوں کیلئے ایک مصیبت بن گئے ہیں، حالانکہ یہ خیر مترتبہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ فرانس، برطانیہ، امریکہ، اور روس فرداً فرداً حریفانہ انداز میں درپردہ اپنے اپنے قدم جما رہے ہیں۔ شام ان ہی پس پردہ عوامل مکروہ کا شکار ہے۔

سابقہ شرقِ اردن اور موجودہ ہاشمی اردن کا شاہ عبداللہ اپنے اقتدار کی توسیع میں مصروف ہے۔ فلسطین کا جو علاقہ اس کی افواج نے فتح کیا تھا اس کا اردن سے قریب الحاق ہو چکا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ شرق اردن کا نام بدل کر اردن کر دیا گیا ہے۔ وہ شام کلاں کا خواب دیکھ رہا ہے اور گرد و پیش اپنے حلیف پیدا کر رہا ہے۔ اگست کے نصف آخر میں اس نے براستہ مصر انگلستان کا سفر کیا۔ اگست کے اوائل میں وہ "غیر سرکاری طور پر" شاہ طہران کی دعوت پر جا کر ایران سے معاہدہ دوستی طے کر آیا ہے، جس کی رو سے دونوں ممالک بین الاقوامی معاملات میں تعاون کریں گے۔

عبداللہ کے انگلستان پہنچنے سے پیشتر امیر عبدالالٰہ، عراق کا ریجنٹ، اور عبداللہ کا چچا زاد بھائی انگلستان پہنچ چکا تھا۔ نوری السعید، عراقی وزیر اعظم ۱۶ اگست کو انگلستان پہنچا۔ اس زمانہ میں برطانیہ نے مشرق وسطیٰ میں متعین سفیروں کو طلب کیا اور درمیان سیاست مشرق وسطیٰ کی کانفرنس منعقد کی تا کہ بدلے ہوئے حالات میں برطانیہ کی حکمت عملی کا جائزہ لیا جائے۔ قدرتی طور پر اس کانفرنس کے کوائف کو منظر عام پر نہیں آنا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے نتائج کا رفتہ رفتہ اندازہ ہو جائے گا۔

عراق، اردن اور مصر برطانیہ کے حلقہ اثر میں ہیں۔ امریکہ "توازن" یا "عدم توازن" کو اپنے حق میں بدلنا چاہتا ہے۔ حسنی الزعیم آہستہ آہستہ امریکی حلقہ اثر میں چلا گیا تھا۔

شاہ عبداللہ برطانیہ سے رخصت ہو کر ۸ ستمبر کو سپین میں فرانکو کا مہمان ہوا اور وہاں کے آثار ملاحظہ کرنے میں مصروف ہے۔

شام کے ایک اخبار نے اطلاع دی ہے کہ نوری السعید انگلستان سے ایک سکیم لایا ہے جسے مصر میں عرب نمائندوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ، امریکہ اور عرب ممالک اجتماعی حلیف بن جائیں گے اور پھر مشرق وسطیٰ کو شامل کر کے کمیونزم کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں گے۔ ہر چند برطانیہ نے اس کی تردید کر دی ہے لیکن یہ تجویز ایسی نہیں کہ اسے خلاف قیاس کہا جا سکے۔ امریکہ کی بین الاقوامی حکمت عملی کا یہ صحیح آئینہ ہے، لہذا بالکل قابل فہم۔

مصر مصر کے وزیر اعظم نے ۲۵ جولائی کے آخر میں استعفیٰ دیدیا۔ مستعفی وزیر اعظم، ابراہیم ہادی پاشا، ۲۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو نقراشی پاشا کے قتل کے بعد وزیر اعظم بنا تھا۔ ہادی پاشا کی وزارت مخلوط تھی جس میں سعدی پارٹی اور لبرل کانسٹی ٹیوشنلسٹ پارٹی شامل تھیں۔ باہمی اختلافات اس استعفیٰ کا باعث ہوئے ہیں۔ نئی وزارت سری پاشا نے مرتب کی ہے۔ نئے وزیر اعظم نے ۳ اگست کو اخباری نمائندوں کو بتایا کہ مصر امریکہ سے یہ درخواست کرنے پر غور کر رہا ہے

کہ اسے مارشل لا ادارہ میں شریک کیا جائے۔ قائد حزب اختلاف، مکرم عبید پاشا نے یکم اگست کو ایوان نائبین میں مطالبہ کیا کہ مارشل لا اٹھا دیا جائے اور نظربندوں کو رہا کر دیا جائے۔

سائرانیکا لیبیا کے ایک حصہ سائرانیکا میں امیر ادریس السنوسی نے جولائی میں آزادی کا اعلان کر دیا تھا جسے برطانیہ نے غیر معمولی سرعت سے تسلیم کر لیا تھا۔ اسی وقت معلوم ہو گیا تھا کہ یہ آزادی اندرونی امور سے متعلق ہو گی اور برطانوی فوجی استحکام کے زیر سایہ تھی۔ اب امیر موصوف کے لندن جانے اور مذاکرات کرنے کے بعد برطانیہ نے ایک منشور شائع کیا ہے جس میں سنوسی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ملک کا آئین بنا سکے۔ وزیروں کا انتخاب امیر خود کرے گا۔ امور خارجہ اور دفاع اور امن و قانون (بشرطیکہ مقامی حکام مناسب تحفظ نہ کر سکیں) برطانیہ کے سپرد ہوں گے۔ ایسے قانون اور مالی مشیر برطانوی ریذیڈنٹ کے "مشورہ" سے مقرر ہوں گے۔ ریذیڈنٹ کو یہ بھی حق حاصل ہوگا کہ مکمل آزادی ملنے تک موجودہ منشور منسوخ کر دے۔ یا اس میں ترمیمات کر دے۔ اس منشور سے سائرانیکا کی آزادی کی حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

عرب لیگ فلسطین کی شکست سے عرب حکومتوں کے ساتھ عرب لیگ کو بھی کافی صدمہ پہنچا ہے۔ کم و بیش سال بھر سے اس کا کوئی اجلاس نہیں ہو سکا۔ عربی حکومتیں اندر اندر اپنی شکست اور ملکی پریشانیوں کے لئے ایک دوسرے کو یا عرب لیگ کو مطعون کر رہی ہیں۔ ان میں نمایاں حیثیت نوری السعید، عراقی وزیر اعظم کو حاصل ہے۔ وہ خصوصیت سے عرب لیگ کی موجودہ قیادت تبدیل کرانا چاہتے تھے۔ اگست میں عرب لیگ کے اجلاس کے انعقاد کا اعلان ہوا تاکہ فلسطین کی وجہ سے عرب ممالک میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ان کا ارتفاع کیا جائے۔ لیکن بعد میں عزام پاشا، سکرٹری جنرل، نے اعلان کیا کہ مجوزہ اجلاس غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی ہو گیا ہے۔

اسلامستان یوں تو اسلامستان ایک شخص کے دماغ کی اپج ہے جو صرف پاکستان کی پیداوار ہے اس لئے اس کا تذکرہ پاکستان کے تحت ہونا چاہیئے تھا لیکن چونکہ ان دنوں اس کا چرچا ممالک اسلامیہ میں ہو رہا ہے اس لئے اس کا تذکرہ اسی جگہ ضروری سمجھا گیا ہے۔

چودھری خلیق الزمان، صدر پاکستان مسلم لیگ نے کس انداز سے پاکستان مسلم لیگ کی نظامت سے صدارت تک رسائی حاصل کی اور اب کیسے اس صدارت کو عالمگیر مسلم لیگ کی صدارت و قیادت کا ذریعہ بنا رہے ہیں، اس کا جائزہ سابقہ اشاعتوں میں لیا جا چکا ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ چودھری صاحب نے کیسے قرآن کو درمیان میں لا کر "اسلامستان" کا ڈھونگ کھڑا کیا۔ الغرض آپ ان دنوں مسلم ممالک کی سیاحت فرما رہے ہیں تاکہ "ایک عالمگیر عوامی لیگ" تشکیل کریں۔ آپ ۳ ستمبر کو کراچی سے (اپنے الفاظ میں) "جیسے آپ تنہا پیدا ہوئے تھے اسی طرح تنہا" روانہ ہو گئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاست پر مجملاً تبصرہ ادھر کیا جا چکا ہے اور وقتاً فوقتاً ان کے سیاسی کوائف و تحریکات کا جائزہ لیا جاتا رہتا ہے۔ ان ممالک میں ہنوز ملوکیت کا دور ہے۔ وہاں

نہ جمہوری طرز حکومت ہے نہ جمہور کی سیاسی جماعتیں۔ وہاں کی سیاست، سیاست ملوک ہے۔ جمہور وہاں شریک حکم نہیں، بلکہ محکوم ہیں اور درماندہ اور پسماندہ۔ ان ممالک کے عوامی، نمائندوں سے پاکستان مسلم لیگ کے عوامی صدر ملاقات فرمائیں گے اور حزب لیگ جسے آپ حکمرانوں کی نمائندہ جماعت سمجھتے ہیں، کے مقابلہ میں جمہور کی عالمگیر جماعت قائم کریں گے۔

۱۹ اگست کو کراچی میں آپ نے، اسلامستان کے نام کے جواز میں یہ دلیل دی:

اگر یہودی اپنی حکومت کو اسرائیل کہہ سکتے ہیں تو ہم اپنی حکومت کو اسلامستان کہنے میں کیوں عار محسوس کریں۔

چودھری صاحب کا دعوٰی تو غیر حکومتی۔ عوامی۔ لیگ کی تشکیل کا تھا۔ لیکن اب وہ اسرائیلیوں کی مثال سے متاثر ہو کر عوامی لیگ کو "اپنی حکومت" تصور کر کے "اسلامستان" کا نام دے رہے ہیں۔ اسلامستان چودھری صاحب کے نزدیک، جملہ مسلمانان عالم کی "قرآنی حکومت" ہے۔ اس تصور کے باوصف آپ نے .... فرمایا کہ غیر مسلم حکومتیں بھی اسلامستان میں شریک ہو سکتی ہیں اور اگر وہ شریک ہوں تو انہیں مساوی حقوق و اختیارات دیئے جائیں گے۔ چودھری صاحب کچھ عرصہ سے جو "قرآنی حکومت" کا تصور پیش کرتے چلے آ رہے ہیں، یہ اُس کا تتمہ ہے۔ اس پراگندگی فکر و انتشار ذہنی کے ساتھ عالم اسلام کی سیاحت ہو رہی ہے اگر کسی نے کی بات نہیں۔ چودھری صاحب بتدریج بلکہ ہو جائیں گے اور صرف خلیفۃ المسلمین کے رنگ میں جلوہ گر ہوں گے۔

انڈونیشیا

انڈونیشیا میں بالآخر ۲۹ جولائی کو جنگ بند کر دینے سے متعلق سمجھوتہ ہو گیا۔ جنگ بند کرنے کے بعد اب انڈونیشیا اور ہالینڈ کے نمائندے ہیگ میں باہمی مذاکرات میں مصروف ہیں تاکہ انڈونیشیا کو اقتدار منتقل ہو سکے اور ڈچ انڈونیشیا یونین قائم ہو سکے۔ یہ گول میز کانفرنس ۲۳ اگست کو شروع ہوئی اور اب تک جاری ہے۔ ہالینڈ قابل فہم طور پر اپنی استعماری اغراض کے پیش نظر موانعات پیدا کر رہا ہے۔

۳ اگست کو انڈونیشیا کے ری پبلکن اور فیڈریشن والے حصوں نے باہم اتفاق کر لیا اور انڈونیشیا کے مستقبل کے متعلق فیصلہ کر لیا کہ ملک کی آئندہ حیثیت ریاست ہائے متحدہ کی ہوگی۔ پرچم بھی ری پبلک کا ہوگا اور زبان بھی ری پبلک کی۔

۱۰ اگست کو ڈاکٹر حتیٰ نے ہالینڈ جاتے ہوئے کراچی میں کہا کہ دو ماہ کے اندر اندر انڈونیشیا کو انتقال اقتدار ہونا چاہیئے۔ اگر دو ماہ میں کوئی تصفیہ نہ ہو سکا تو مزید مذاکرات بے سود ہوں گے۔ کانفرنس کے دوران میں ڈاکٹر حتیٰ نے مطالبہ کیا کہ سنہ ۱۹۴۹ء میں انتقال اقتدار ہو جانا چاہیئے۔ ۱۸ ستمبر کو ڈاکٹر حتیٰ نے کہا کہ یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ اگر کانفرنس ناکام ہوئی تو .... ؟ کانفرنس کو لازماً کامیاب ہونا چاہیئے۔

جمعیت اقوام متحدہ | جمعیت اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا چوتھا سالانہ اجلاس ۲۰ ستمبر کو لیک سکس میں منعقد ہو رہا ہے۔ دیگر کاروبار نپٹانے کے علاوہ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مشرق و مغرب یعنی روس اور امریکہ کی کشمکش کو بھی سلجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ اجلاس کوئی گیارہ ہفتے تک جاری رہیگا۔ پاکستانی وفد چودھری محمد ظفر اللہ خاں، وزیر خارجہ کی قیادت میں لیک سکس پہنچ چکا ہے۔

ڈالر۔ سٹرلنگ | مارشل امداد کو اندرون یورپ ڈالر میں تبدیل کرنے کی جو صورت امریکہ نے پیدا کی اس کی زد برطانیہ پر یوں پڑی کہ اس کے سونے اور ڈالر کا ذخیرہ بتدریج کم ہونا شروع ہو گیا۔ اس مشکل کے حل اور برطانیہ کی امداد کے لئے امریکہ نے جولائی میں بلجیم کو براہ راست مزید ڈالر دیدیئے تاکہ اتنا بوجھ برطانیہ کے کندھوں سے ہلکا ہو جائے۔ لیکن برطانیہ کا ڈالری اندوختہ جس ... رفتار سے کم ہوتا جا رہا تھا اس سے متعلق بھی تشویش پیدا ہو گئی۔ دولت مشترکہ کے وزرائے خزانہ کی ایک کانفرنس اسی سلسلہ میں جولائی میں لندن میں منعقد ہوئی اس میں فیصلہ کیا گیا کہ سٹرلنگ حلقہ کے ممالک ڈالر حلقہ سے درآمد کم کر دیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ڈالر بچائے جا سکیں۔ ۷ ستمبر کو واشنگٹن میں برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا کے وزرائے خزانہ اور خارجہ کے مذاکرات شروع ہوئے۔ اس اثنا میں امریکہ نے برطانیہ سے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ ڈالر کی رو سے سٹرلنگ کی شرح تبادلہ کم کر دی جائے۔ کرپس نے متعدد مرتبہ اس کی مخالفت کی اور یہ تجویز پیش کی کہ امریکہ سٹرلنگ حلقہ سے زیادہ سے زیادہ اشیا خریدے، اپنے محصولات میں مناسب تبدیلیاں کرے اور نجی سرمایہ کی حوصلہ افزائی کرے تاکہ وہ ممالک غیر میں استعمال کیا جا سکے۔ واشنگٹن کانفرنس کی طرف سے اس فیصلہ کا اعلان ہوا کہ سٹرلنگ حلقہ کے ممالک کی طرف سرکاری اور غیر سرکاری سرچشموں سے ڈالر کا بہاؤ تیز تر کر دیا جائے گا۔ ۱۸ ستمبر کو کرپس لندن پہنچا اور کانفرنس کو کامیاب ترین کہا۔ دوسرے ہی دن یعنی ۱۹ ستمبر کو یہ حیران کن اعلان ہوا کہ برطانیہ نے سٹرلنگ کی قیمت کم کر دی ہے۔ سابقہ شرح تبادلہ کے مطابق ایک سٹرلنگ ۴.۰۳ ڈالر کے برابر ہوتا تھا۔ اب ۲.۸۰ کے برابر ہو گیا۔ ایک لحاظ سے برطانیہ کا یہ فیصلہ حیران کن نہیں تھا کیونکہ ڈالر منڈی سے جو تجارت ہو رہی تھی اس میں سٹرلنگ کا بہاؤ عملاً گرا ہوا تھا۔ حکومت نے اس عملی شرح تبادلہ کو سرکاری حیثیت دے دی۔ اس فیصلہ کا اثر تمام دنیا پر بالخصوص سٹرلنگ حلقہ پر پڑا ہے۔ پاکستان کو بھی اس نئی صورت حالات کے مطابق شرح تبادلہ پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ توقع ہے کہ ایک دو روز میں حکومت کی طرف سے باقاعدہ اعلان ہو جائے گا۔ اس نئی صورت حال کے مطابق روپیہ کی شرح تبادلہ مقرر ہو جائے گی۔

مغربی یورپ | امریکہ کے بحری، بری اور فضائی عساکر کے چیف آف سٹاف ۳۰ جولائی کو جرمنی میں وارد ہوئے اور اوقیانوسی معاہدہ والے دول کے عسکری قائدین سے اس عسکری تنظیم سے متعلق بحث و تمحیص کی۔ جو اوقیانوسی معاہدہ کے تحت معرض تشکیل میں آسکے گی۔ واپسی پر یہ حضرات لندن میں ہر سہ برطانوی افواج کے چیف آف سٹاف سے بھی ملے۔

۱۰ اگست کو روس کی قومی خبر رساں ایجنسی طاس نے ان کانفرنسوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کانفرنسوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جرمنی کی تقسیم کن اغراض کے لئے تیار کی جا رہی ہے۔ جرمنی ایک نئی جنگ کا پیش خیمہ ہے۔

جمہوریہ جرمنی غربی

مغربی جرمنی کے انتخابات عامہ کے بعد پہلی جمہوریہ ۷ ستمبر کو معرض وجود میں آئی ہے۔ اس کے دو ایوان ہیں۔ ایوان اعلیٰ اور ایوان ادنیٰ۔ پہلا چانسلر ایڈنائر ۱۵ ستمبر کو منتخب ہوا۔ یہ چانسلر کرسچین ڈیموکریٹ پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ مغربی جرمنی کے پہلے چانسلر نے جرمنی کے فاتحین کی اس پالیسی کی مذمت کی جس کے ماتحت وہ جرمنی کے کارخانوں کو تاوان کے بہانہ جرمنی سے اٹھا کر اپنے ممالک میں لیجا رہے ہیں۔

کونسل آف یورپ

۱۲ اقوام پر مشتمل "پارلیمان یورپ غربی" کا، بحیثیت ایک مشاورتی اسمبلی، ۱۰ اگست کو سٹراس برگ میں اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں کم از کم دس ممالک مؤسسین کے وزرائے خارجہ شریک ہوئے۔ ہر چند یہ اسمبلی مغربی یورپ تک محدود ہے تاہم اسے "عالمگیر پارلیمان" کا انوکھا تجربہ کہا جا رہا ہے۔ یونان اور ترکی کو بھی کونسل میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی۔

چرچل اور اس کے حامیوں نے واحد یورپی یونین اور اقتصادی یونین کی حمایت کی اور یہ نظریہ پیش کیا کہ یورپی اقوام اپنی قومی آزادی (National Sovereignty) اس یونین کے تابع کریں۔ ماریسن، نائب وزیر اعظم برطانیہ نے اس کی مخالفت کی اور محتاط رہنے کی تلقین کی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مئی ۱۹۵۰ء تک اتحاد یورپ اور واحد مرکزی ادارہ سے متعلق تجاویز تیار ہو کر ارکان ممالک کے پارلیمانوں میں پیش ہو سکیں گی۔

یادداشتوں کی جنگ

یوگوسلاویہ کا ڈکٹیٹر مارشل ٹیٹو پہلے روسی حلقہ اثر میں چلا گیا تھا اور پھر باغی ہو گیا۔ یہ بغاوت روس کی گہری چال ہے اور ایک عظیم دھوکہ یا حقیقت۔ اس کے متعلق رنگا رنگ قیاس آرائیاں ہیں۔ بہرکیف حالات کی ظاہری رفتار میں حقیقت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ یوگوسلاویہ کے آسٹریا سے متعلق کچھ مطالبات ہیں جنہیں وہ آسٹریا سے متعلق معاہدہ میں منوانا چاہتا ہے۔ روس کو شکایت ہے کہ یوگوسلاویہ درپردہ مغربی قوتوں سے ساز باز کر کے اپنے مطالبات منوانا چاہتا ہے۔ چنانچہ ۱۱ اگست کی یادداشت میں روس نے یہ الزام لگا کر اسے روس کا دشمن قرار دیا۔ ۱۲ اگست کے جواب میں یوگوسلاویہ نے بتایا کہ اس نے مغربی دول سے گفتگو ضرور کی لیکن وائشنسکی اور مالوتوف (سابق وزیر خارجہ روس) کے ایما سے کی۔ (یہ خیال رہے کہ ان مطالبات کو دول اربعہ کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس منعقدہ پیرس نے گزشتہ جون میں نامنظور کر دیا تھا)۔ یوگوسلاویہ نے روس پر دورخی کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ ایک طرف اس نے آسٹریا کو کہا کہ وہ اپنی سرحدات کو محفوظ رکھے اور یوگوسلاویہ کو ملک کا متنازعہ حصہ دینے پر رضامند نہ ہو۔ اور دوسری طرف یوگوسلاویہ کو اس کے برعکس مشورہ دیا۔ روس نے ۲۹ اگست کی یادداشت

کو ایشیا میں جمہوریت کا علمبردار" قرار دیا۔ ہو سکتا ہے کہ معاملہ حفاظتی کونسل میں پیش کر دیا جائے۔ امریکہ اس کشمکش کو مفید مطلب بنانے کے لئے یوگوسلاویہ کی طرف جھک رہا ہے۔

برما | کیرن قبائل کی بغاوت جو کسی وقت فرو ہوتی نظر آتی تھی، پھر سے تیز تر ہو گئی ہے۔ چار لاکھ کیرن آبادی گزشتہ آٹھ ماہ سے جس علیحدہ سٹیٹ کے لئے لڑ رہی ہے بعض علاقے اس کا حصول یقینی بتا رہے ہیں۔ حکومت اور باغیوں کے مابین اب تک جو مذاکرات ہوئے وہ بے نتیجہ رہے ہیں۔

چین | کمیونسٹوں کا دباؤ جنوبی چین پر بڑھتا جا رہا ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ قومی حکومت، اپنے موجودہ دارالحکومت کینٹن کو بھی خالی کر دے گی اور چنکنگ کو مرکز بنائے گی۔ ۱۷ ستمبر کو جنوبی چین کے صوبہ ہنان کے گورنر نے بغاوت کر کے صوبے کے مرکز کن چنگ پر قبضہ کر لیا۔ اس سے چینی حکومت کے چنکنگ کو مرکز بنانے کے امکانات کم ہو گئے ہیں۔ کن چنگ گزشتہ جنگ عظیم کی مشہور برما روڈ کا نقطۂ آخری تھا۔ اس کی حدیں برما اور فرانسیسی ہند چینی سے ملتی ہیں۔

پاکی چنگ سے ایک ریڈیائی تقریر میں کمیونسٹوں نے اعلان کیا کہ وہ تبت کو چین کا لاینفک جزو سمجھتے ہیں اور اسے بھی آزاد کر کے دم لیں گے۔ انہوں نے برطانیہ، امریکہ اور ہندوستان پر الزام لگایا کہ وہ تبتی رجعت پسندوں سے مل کر تبت کو حصول آزادی سے محروم کر رہے ہیں۔

کمیونسٹوں کی فتوحات کو دیکھ کر امریکہ اور برطانیہ سرخ چین سے متعلق اپنی روش پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں برطانوی وزیر خارجہ بیون اور امریکہ کے نمائندہ اچیسن کے مابین مذاکرات ہوئے تاکہ یہ طے کریں کہ کمیونسٹ چین کو کس موقع پر تسلیم کرنا مناسب ہوگا۔

جاپان | جاپان کی شکست کی چوتھی سالگرہ پر تقریر کرتے ہوئے میکارتھر نے ۲ ستمبر کو کہا:

> جاپان میں کمیونسٹ خطرہ ختم ہو چکا ہے۔ ملک کی صنعت بحال ہو گئی ہے اور جاپان رسمی معاہدہ کے لئے تیار ہے۔

خلاف کمیونسٹ محاذ | فلپائن کا صدر کوئرینو جو وسط سے چین کے "ڈی" لیڈر چیانگ کائی شک اور جنوبی کوریا سے مل کر جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کے خلاف "متحدہ محاذ" کی تیاری میں مصروف ہے، اگست میں صدر ٹرومین کی دعوت پر امریکہ گیا۔ ملاقات میں ٹرومین نے کہا کہ آپ یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے۔ وہ کیا کچھ لائے گا اور کیا کر سکے گا اس کا اندازہ تو یہیں سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنوبی کوریا کی بین الاقوامی حیثیت بمنزلہ صفر ہے۔ چین سرتاپا کمیونسٹ بن چکا ہے۔ چیانگ کائی شک کا زوال مقدر ہو چکا ہے۔ فلپائن بین الاقوامی سیاست میں امریکہ کا ایک مہرہ ہے۔ ان کی مجموعی مساعی کی کامیابی سے امریکہ ہی حسن ظن رکھ سکتا ہے۔ کمیونزم کی کامیابی کی صحیح تشخیص برطانیہ کے وزیر مستعمرات آرتھر کریچ جونز نے ۲۹ جولائی کو پارلیمان میں کی۔

> یہ صحیح نہیں کہ نوآبادیوں میں بے اطمینانی اور مشکلات کا ذمہ دار صرف کمیونسٹ پروپیگنڈہ ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان علاقوں کے باشندوں کیلئے اپنی حالت کو سدھارنے اور مطلوبہ تبدیلیاں پیدا کرنے کے لئے زبردست کشمکش جاری کرنے کی معقول وجوہ ہیں۔

کمیونزم کو درحقیقت سیاسی محاذ پر نہیں بلکہ اقتصادی محاذ پر شکست دی جا سکتی ہے۔

یہ ادارہ آپ کا ہے

میں آپ حضرات کا جس قدر بھی شکر گزار ہوں کم ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس انداز سے ہم دہلی اور مشرقی پنجاب سے لٹ کر آئے تھے اقتصادی تباہی کے باعث دوبارہ کاروبار قریب ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر آپ میری حوصلہ افزائی نہ فرماتے اور کتاب لمیٹڈ کی تحریک کا موجب نہ بنتے تو یہ ملی ادارہ وجود میں نہ آتا۔

الحمد للہ کہ میں تمام ابتدائی مراحل سے گزر چکا ہوں۔ اب جناب رجسٹرار صاحب بہادر کی طرف سے رجسٹریشن سارٹیفکیٹ حاصل ہو جانے پر عملی اقدام کا اعلان کر دیا جائے گا۔

کتاب لمیٹڈ کا ادارہ اسلامی مساوات کے اصولوں پر قائم ہو رہا ہے۔

جس کی تفصیل میمورنڈم اور آرٹیکلز آف دی ایسوسی ایشن میں ملے گی اور یہ دو روپے بھیج کر حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

میں اپنے ان مشفق اور مخلص احباب کا خاص طور پر شکر گزار ہوں

ملک محمد الیاس صاحب مری	ملک نور الٰہی صاحب اے۔ ڈی۔ ایم۔ مردان
حکیم محمد حسین صاحب گجرات	عبد الرشید صاحب۔ کویٹ۔
شفقت حسین صاحب کراچی۔	ملک محمد عارف صاحب لاہور

آپ کا مخلص

عارف بٹالوی

عارف پبلشنگ ہاؤس۔ رابسن روڈ۔ کراچی